معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۵۰/ روپے۔ فی شمارہ ۱۵/ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/ روپے

پاکستان میں سالانہ ۲۵۰/ روپے — رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/ روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۵۰۰/ روپے — رجسٹرڈ ڈاک ۷۰۰/ روپے

نوٹ: (ہندوستانی روپے کے حساب سے رقم قبول کی جائے گی۔)

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷ اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ----- Phone: (009242) 7280916 5863609

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

☆ کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

پرنٹر، پبلیشر، ایڈیٹر۔ ضیاء الدین اصلاحی نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

جلد ۱۸۰ — ماہ ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۰۷ء — عدد ۶

فہرست مضامین

مقالات

معارف کی ڈاک

آثار علمیہ و تاریخیہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ای میل: email : shibli_academy@rediffmail.com

ویب سائٹ: www.shibliacademy.org

شذرات

اتر پردیش کی وزیر اعلا نے اتر پردیش منظم جرائم کنٹرول بل 2007 (یوپی کوکا) پیش کیا اور کہا کہ امن و قانون کا جائزہ لیتے وقت یہ محسوس کیا گیا کہ ریاست میں منظم جرائم کی جڑیں بہت گہری ہیں اور ان کی بیخ کنی کے لیے مافیاؤں اور منظم مجرمین کے خلاف کارروائی کے لیے ایک کارگر قانون نافذ کرنا ضروری ہے، اس ایکٹ کے تحت انہوں نے اور بھی متعدد طرح کے مجرموں کے استیصال کر دینے کا عزم ظاہر کیا، ان کا کہنا ہے کہ ان کی حکومت کی تشکیل سے قبل ریاست میں منظم مجرمین کو سرکاری تحفظ دیے جانے کے کئی معاملے سامنے آئے تھے لیکن اب ان کو سرکاری تحفظ دیا جانا غیر قانونی قرار دیا گیا، مجرموں کی اقتصادی ریڑھ توڑنے کے لیے اتھارٹی کو خاصے اختیار دیے گئے ہیں، اس کے علاوہ ضلع مجسٹریٹ کی صدارت میں ضلع منظم جرائم کمیٹیوں کی تشکیل کا بھی بندوبست کیا گیا، یہ کمیٹیاں ریاستی اتھارٹی کی ہدایت کے مطابق کام انجام دیں گی، اس سخت ایکٹ کے تحت کم سے کم پانچ سال، پانچ لاکھ روپے سے لے کر عمر قید اور سزائے موت نیز دس لاکھ روپے تک کے جرمانے کی گنجائش رکھی گئی ہے، مقدموں کے جلد فیصلے کے لیے روزآنہ یوپی کوکا کے تحت درج معاملات کی سماعت خصوصی عدالتوں میں کی جائے گی، وزیر اعلا کو یقین ہے کہ یوپی کوکا سے غنڈوں، مافیاؤں، بااثر افراد، دبنگوں، پیشہ ور مجرموں اور سماج میں خوف و دہشت پھیلانے والے منظم جرائم میں ملوث عناصر کو پوری طرح کچلنے میں کامیابی ملے گی۔

مجرموں کو کچلنے اور جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا جذبہ نہایت قابل ستائش ہے، یہ واقعتاً ملک اور ریاست کی بڑی خدمت ہے، اس وقت جرائم پیشہ لوگوں نے شریف اور باعزت لوگوں کی ناک میں دم کر رکھا ہے، مگر دولت کی لالچ مجرموں، مافیاؤں اور غنڈوں ہی کو نہیں ہے، اہل سیاست اور حکومت کی انتظامی مشنریاں کیا کم بدعنوان ہیں جب کہ یہی لوگ حکومتوں کے دست و بازو ہوتے ہیں، ان کی موجودگی میں جرائم کا خاتمہ کیسے ہوسکتا ہے، یہ کون نہیں جانتا کہ ارباب سیاست اور مافیا سرغناؤں میں سیاسی و مالی فائدے حاصل کرنے کے لیے ناپاک گٹھ جوڑ رہتا ہے، جرائم پیشہ افراد ڈرا دھمکا کر سیاسی پارٹیوں کے لیے ووٹ حاصل کرتے ہیں اور پھر ان سے ان کی قیمت اپنی مجرمانہ سرگرمیوں کے سلسلے میں قانون اور پولس سے بچنے اور دوسرے فائدوں کے حصول کی شکل میں وصول کرتے ہیں، یہی گٹھ جوڑ مافیاؤں کو بہت دلیر بنا دیتا ہے اور وہ بے دھڑک مجرمانہ سرگرمیوں پر آمادہ ہو جاتے ہیں، اس لیے اگر وزیر اعلا اپنے عزم و

ارادہ میں مخلص ہیں تو انہیں دونوں گروہوں کے گٹھ جوڑ کو ختم کرنے کے لیے قانون بنانا چاہیے اور ذہن و کردار سازی پر توجہ کرنی چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ جو قوانین پہلے سے بنے ہوئے ہیں، اگر حکومتیں ان کا نفاذ کریں اور ان کی مشنریاں ان پر صحیح طور سے عمل درآمد کریں تو یہی قوانین مجرمین سے نمٹنے اور ملک اور ریاست کو جرائم سے پاک کرنے کے لیے کافی ہیں، کسی نئے قانون کو بنانے کی ضرورت ہی نہیں۔

اتر پردیش میں وزیر اعلا کی سب سے بڑی حریف پارٹی کے سربراہ ملائم سنگھ نے یوپی کوکا پر اپنا شدید ردعمل ظاہر کیا ہے اور بڑے تلخ انداز میں کہا ہے کہ اس ایکٹ کا استعمال سماج وادی پارٹی کے کارکنوں کے خلاف کیا جاسکتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس کا استعمال ریاست کے مجرمانہ شبیہ رکھنے والے ۲۲ وزیروں کے خلاف کیا جانا چاہیے جن میں سے ہر ایک پر ۲۰ سے زیادہ مقدمے ہیں، اسی پارٹی کے جنرل سکریٹری امر سنگھ نے بڑے سخت لب و لہجہ میں اسے کالا قانون کہا ہے جس سے ان کی پارٹی کے لیڈر اور ورکر ڈرنے والے نہیں ہیں، انہیں بھی اندیشہ ہے کہ یوپی کوکا کا ناجائز استعمال سماج وادی پارٹی کے لیڈروں اور کارکنوں کے خلاف ہوگا، بی جے پی نے بھی یوپی کوکا کے غلط استعمال کا اندیشہ ظاہر کیا، وہ اس لیے پریشان ہے کہ اس میں مسلمانوں کے لیے چھوٹ ہے اور اس سے ان کی خوشامد کی پالیسی ظاہر ہورہی ہے، اس کے ریاستی صدر نے کہا کہ اس میں دہشت گردی اور دہشت گرد تنظیموں سے لڑنے کی کوئی تجویز نہیں، ممنوعہ تنظیم ایس آئی ایم، حرکت الجہاد اور آئی ایس آئی وغیرہ کو اپنی سرگرمیاں چلانے کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا گیا ہے، دہشت گرد عناصر کو تحفظ اور رہائش مہیا کرانے والوں کے خلاف کارروائی کا بل میں کوئی ذکر نہیں ہے، ان کا کہنا ہے کہ پانچ ماہ کے مایاوتی کے دور حکومت نے حریف پارٹیوں کے کارکنوں کو پریشان کیا ہے، پتا نہیں کیوں بی جے پی لیڈر کو سنگھ پریوار کی دہشت گری نظر نہیں آتی۔

سیکولر حکومتیں اس طرح کے قوانین وضع کرنے میں چاہے کتنی ہی سنجیدہ اور مخلص کیوں نہ ہوں لیکن ان کا سارا دارومدار پولس اور انتظامیہ کے ارکان پر ہوتا ہے، جن کو غیر معمولی اختیارات حاصل ہوتے ہیں، یوپی کوکا میں بھی اتھارٹی کو خاصے اختیار دینے کی بات کہی گئی ہے جن کا سارا نزلہ مسلمانوں پر گرتا ہے اور وہ اپنے اختیار کا بڑی بے رحمی سے ان کے خلاف استعمال کرتے ہیں، سرکاری ملازمتوں اور بالخصوص پولس میں مسلمان اکا دکا اور برائے نام ہوتے ہیں، ان کا پورا اسٹاف بی جے پی کی ذہنیت والا ہوتا ہے جن میں تعصب اور مسلم دشمنی کا زہر بھرا ہوتا ہے، فرقہ پرستوں اور شرپسند عناصر نے مسلمانوں کو بدنام کرنے اور انہیں دہشت گرد قرار دینے کی مکمل مہم شروع کر رکھی ہے، پولس کے یہ متعصب اور فرقہ پرور

لوگ بھی اس مہم کو کامیاب بنانے کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں اور ان کو ہر واقعہ اور ہر جرم میں مسلمان ہی ملوث نظر آتے ہیں، خطا کسی کی ہوتی ہے ان کی تفتیش میں مسلمانوں ہی کو خطا کار ثابت کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ مالیگاؤں کی جامع مسجد میں شب برات، اجمیر کی درگاہ اور حیدرآباد کی مکہ مسجد کے بم دھماکوں میں بھی اس نے مسلمانوں کو مجرم بنا کر گرفتار کیا، تنگ کیا اور ناقابل برداشت اذیتیں دیں، گجرات کی طرح مہاراشٹر اور آندھرا پردیش میں کانگریسی حکومتوں نے بے گناہ مسلمانوں کو حراستوں میں ستایا اور ان کا انکاؤنٹر کیا، اس کے مقابلے میں دوسرے فرقوں کے قصوروار لوگوں کی وہ پردہ پوشی کرتی ہے اور حقائق سامنے آجانے کے بعد بھی ان سے تعرض نہیں کرتی، ہم ان صفحات میں اس طرح کے واقعات پہلے نقل کرتے رہے ہیں، تازہ واقعہ مغربی بنگال کی کمیونسٹ حکومت کا ہے جہاں پولس کی طاقت اور صنعت کار کی دولت نے مسلمان مقتول کے قاتل کو چھپانے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا، دوسرا واقعہ ممبئی پولس کا ہے، اسے یہاں کی کسی عمارت کو بم سے اڑانے کی خبر ملی جب اس کا مجرم گرفتار ہوا تو پولس اسے عبداللہ سمجھ کر سخت سے سخت کارروائی کرتی رہی لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ دنیش گپتا ہے تو اس نے غالباً معاملہ دبا دیا، ان وجوہ سے ہمارا خیال ہے کہ یو پی اے ایکٹ سے بھی پولس اور اتھارٹی کو مسلمانوں کو تنگ کرنے کا ایک حربہ مل جائے گا۔

یہ بات تو پہلے ہی سے عیاں تھی کہ گودھرا ٹرین المیہ کے بعد گجرات میں مسلمانوں کا قتل عام وہاں کے وزیر اعلا نریندر مودی کی کارستانی اور بی جے پی کی منصوبہ بند سازش کا نتیجہ تھا اور اس کا مقصد مسلمانوں کی باقاعدہ نسل کشی تھا، چنانچہ وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے بھی اسے مسلمانوں کا ہولوکاسٹ کہا ہے، اب ۲۵؍اکتوبر ۲۰۰۷ء کو آج تک چینل نے تہلکہ میگزین کی مدد سے اس ظلم وخوں ریزی کا ایک دستاویزی ثبوت مہیا کر دیا ہے جس میں آر ایس ایس، وشو ہندو پریشد اور بی جے پی کے سرگرم کارکنوں کو اقبال جرم اور یہ اعتراف کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ ۲۰۰۲ء میں گجرات کے مسلم کش فسادات میں انہوں نے کیا کارنامے انجام دیے تھے، حالانکہ ان اعتراف کردہ معاملات کو پولس پہلے بے بنیاد واقعہ قرار دے چکی ہے، تہلکہ انکشاف کے بعد سے عام طور پر مودی کی برطرفی کا مطالبہ کیا جارہا ہے جس کی کوئی توقع کانگریس اور یو پی اے حکومت سے نہیں ہے، کانگریس اور بی جے پی دونوں ایک دوسرے کو اس انکشاف کے لیے ذمہ دار قرار دے رہی ہیں، ذمہ دار خواہ کوئی ہو اس سے انتخاب میں بی جے پی کو فائدہ ضرور پہنچے گا۔

☆☆☆☆

مقالات

تفسیر ماجدی اور سائنسی مباحث

از:- حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی

مولانا عبدالماجد دریابادی، نامور فلسفی، بہترین صحافی، صاحب طرز ادیب وانشاپرداز کی حیثیت سے محتاج تعارف نہیں لیکن ان کا سب سے وقیع کارنامہ ان کی تفسیر ہے جو تفسیر ماجدی کے نام سے مشہور ہوئی، اردو اور انگریزی میں ان کی یہ تفسیریں اہل علم کی خاص توجہ کا مرکز رہیں۔

اصلاً انہوں نے انگریزی تفسیر سے ابتدا کی، ۳۳ء میں وہ اپنے مربی ومرشد مولانا اشرف علی تھانویؒ کی خانقاہ میں تھے تو وہیں مولانا سراج الحق مچھلی شہری نے ان سے کہا کہ افسوس کا مقام ہے کہ ہم اہل سنت وجمہور امت کی طرف سے قرآن مجید کا کوئی انگریزی ترجمہ ایک بھی نہیں، آپ ضرور یہ کام کر ڈالیے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں شاید صرف انگریزی ترجمہ قرآن کی فکر ہوئی لیکن جب کام شروع ہوا تو اصل افادیت اسی میں نظر آئی کہ ترجمہ کے ساتھ تفسیر بھی ہونی چاہیے، چنانچہ انہوں نے اپنے دوسرے علمی اور ادبی کاموں کو روک کر حتی کہ اپنے مقبول ہفتہ وار "سچ" کی اشاعت کو بھی روک کر صرف خدمت قرآن مجید کو اپنا مقصد وحید بنالیا اور سال ڈیڑھ سال کی مدت میں سینکڑوں مصادر وماخذ کی مدد سے یہ کام پورا بھی کرلیا، اس سلسلے میں انہوں نے عرب، شام، مصر، عراق کے جغرافیے، ان ملکوں اور ان کی قوموں کی تاریخ، روم و ایران کی تاریخ، یہود ونصاریٰ کے مذہب کی تاریخ، مجوس ومشرکین کے عقائد اور تمدن کی سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ بھی کیا، انہوں نے لکھا بھی ہے کہ اس عرصے میں گویا دنیا ہی ترک کردی، یہ

انگریزی ترجمہ وتفسیر مکمل ہوگیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں یہ بات ڈالی کہ اردو میں بھی یہ کام ہوجائے، چنانچہ تفصیل و وسعت کے ساتھ اردو ترجمہ وتفسیر کا مبارک کام بھی انجام پاگیا۔

تفسیر ماجدی کی خصوصیات اور امتیازات پر لکھا جاچکا ہے، یہاں اس میں درج سائنسی مباحث کے متعلق گفتگو مقصود ہے، حالاں کہ یہ ان کے نزدیک بنیادی موضوع کبھی نہیں رہا لیکن ایک جگہ انہوں نے لکھا کہ خلائی پرواز نیز جدید سائنسی تحقیقات کا لحاظ بھی آیات طبیعیات و تکوینیات میں ضروری تھا، اسی لیے آخر دم تک مولانا نے جابجا اس قسم کی تحقیقات کی جانب اشارہ جاری رکھا۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ میں نے انگریزی تفسیر نہیں دیکھی لیکن مولانا کی تحریروں سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قریب تمام مباحث یا ان کا خلاصہ اردو میں آگیا ہے، اس لیے یقین ہے کہ ان دونوں زبانوں کی تفسیروں میں زیادہ فرق نہیں ہوگا۔

علم تاریخ، جغرافیہ، آثار قدیمہ اور دوسرے آسمانی صحیفوں اور آسمانی مذاہب کا مطالعہ اور تقابل کو اگر سائنس کے وسیع مفہوم میں شامل کرلیا جائے تو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی اس رائے کو یہاں بیان کیا جاسکتا ہے کہ:

”تفسیر ماجدی اپنی بعض خصوصیات میں منفرد ہے اور تمام تفسیری ذخیرے کی موجودگی میں اس کی بہر حال ضرورت تھی قرآن مجید کے بیسیوں مقامات ایسے ہیں کہ ان میں قرآن کا اعجاز اور وحی محمدیؐ کی صداقت پورے طور پر اس وقت تک عیاں نہیں ہوسکتی جب تک ان آیات کا تاریخی پس منظر سامنے نہ ہو اور جن اقوال کی تردید یا نفی کی گئی ہو ان کی حقیقت واصلیت اور ان کی اس دور میں اہمیت ومقبولیت اور عمومیت معلوم نہ ہو۔

......مولانا دریابادی نے تقابل مذاہب اور تقابل صحف سماوی کا منظم، وسیع اور مخلصانہ مطالعہ کیا......راقم حروف کی نظر میں ان کا اس عہد میں نہ صرف ہندوستان بلکہ کسی اسلامی ملک میں بھی کوئی ہمسر اور نظیر نہیں آتا“۔(۱)

(۱) مقدمہ تفسیر ماجدی، ص ۲ و ۳۔

مولانا علی میاںؒ کی یہ تحسین سخن شناس محض مداحی نہیں تھی، اس تعریف اور مدح کی کچھ وجہیں بھی ہیں اور یہ مولانا علی میاں کی اس تحریر سے نمایاں ہیں کہ:

”اب نیا دور تھا، عقلی علوم اور فلسفہ یونان کے بجائے تجربی سائنس بالخصوص طبیعیات کا دور تھا، ہر شعبہ میں نئے نئے انکشافات وتحقیقات ہورہی تھیں، تاریخ وجغرافیہ کے علم نے وہ اہمیت اختیار کرلی تھی جو انہیں کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی، تمدن، علم المعیشت، اقتصادیات اور قانون نے غیر معمولی وسعت ومقبولیت حاصل کرلی تھی، بہت سے قدیم مسلمات اور جغرافیائی روایات محل نظر بلکہ خلاف واقعہ سمجھی جانے لگی تھیں، نئی کھدائیوں اور آثار قدیمہ کی دریافت نے نئی نئی حقیقتوں کی نقاب کشائی کی تھی، اس سب سے عالم اسلام بالخصوص اس کے علمی حلقے پر نئی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، اب ان جدید معلومات وتحقیقات کی روشنی میں اعجاز قرآن اور صداقت قرآنی کو اسی طرح عیاں اور عالم آشکار کرنا تھا جیسا کہ قدیم علما و متکلمین اور مفسرین قرآن کو اپنے زمانے میں یونانی فلسفہ و حکمت اور الحاد و باطنیت کا مقابلہ کرنا پڑا تھا“۔(۱)

یہ کار عظیم تھا اور مولانا دریابادی نے اس کے لیے ہمت کی اور اس کے تمام تقاضوں کو نظر میں رکھا اور یہ ان کی تحریروں سے پوری طرح ظاہر ہے کہ:

قرآن مجید کی مخاطب اول وبراہ راست قوم عرب تھی، ساتویں صدی کے ثلث اول کی، اس لیے مخاطبات میں ان کے فہم واستعداد کی اور ان کے مسلمات عقل ونقل کی رعایت حد درجہ ضروری تھی، حکایات وامثال میں اگر ذکر ارجن وبھیم کا یا رستم واسفندیار کا یا یونان کے مشاہیر کا چھیڑ دیا جاتا یا گردش ارض وآفتاب کے ضمن میں اگر نیوٹن اور آئن سٹائن کے زمانے کے نظریات وتحقیقات کا حوالہ دیا جانے لگتا، تاریخ، جغرافیہ، عام علوم وفنون کے سلسلے میں کوئی بھی ایسی بات وضاحت وصراحت کے ساتھ فرمادی جاتی جو مخاطبین اول کی فہم واستعداد سے بالاتر ہوتی تو یہ سرتاسر خلاف حکمت ومصلحت ہوتی، اس لیے قرآن مجید نے انتہائی حکیمانہ طریقہ یہ اختیار کیا کہ ان

(۱) مقدمہ تفسیر ماجدی، ص ۲ و ۳۔

ساری فرعی، ضمنی، ثانوی بحثوں سے متعلق اس نے صراحت تو ایک بار بھی مذاق عرب کے خلاف نہیں کی اور اہل عرب کے علمی، عقلی، فکری مزعومات کو ان کے حال پر چھوڑے رکھا لیکن اشارے ایسے برابر رکھ دیے اور کلام میں لچک اتنی پیدا کردی کہ آئندہ نسلیں اپنے اپنے دور کے ماحول فکری کے مطابق اس کتاب الٰہی کی تشریح و تعبیر میں آزاد رہیں۔(۱)

جدید مفسر کے لیے مولانا کی رائے تھی کہ وہ تاریخ اقوام پر بھی نظر رکھتا ہو اور جغرافیہ عالم پر بھی اور یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور عرب اور نواح عرب کے شرکیہ مذاہب سے بھی فی الجملہ واقفیت رکھتا ہو اور جدید سائنس کے بھی مختلف شعبوں خصوصاً فلکیات سے بھی مطلقاً بے بہرہ نہ ہو ورنہ باوجود تدین و تقوی، صالحیت و مقبولیت کے سخت علمی غلطیوں کا شکار ہوسکتا ہے۔(۲)

ایک اور موقع پر فرمایا کہ مفسر کا صالح و متقی ہونا اس کی ضمانت نہیں کہ اس کی تاریخی جغرافی اور عام سائنسی معلومات بھی صحیح ہوں۔(۳)

وہ خوب جانتے تھے کہ عقائد، عبادات، معاملات اخلاق کے مسائل ہیں لیکن قرآن میں صرف یہی کچھ نہیں ہے، بالواسطہ اور ضمناً ہی سہی لیکن تاریخ و جغرافیہ اور سائنس کے سینکڑوں نکتوں پر گفتگو کی جاسکتی ہے۔

مولانا تفسیر ماجدی کا مطالعہ کرنے والوں کو بار بار یہ ذہن نشین کراتے تھے کہ چاند، سورج اور ستاروں کے ذکر میں اس زمانے کے ایسے انداز میں بات کی گئی ہے کہ وہ آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے لیکن اس میں اتنی لچک بھی ہے کہ صدیوں بعد جب فلکیات کے نظریات بدلے تو بھی الفاظ قرآنی کی تفسیر و تشریح، ذہنوں پر گراں نہیں گزری، زمین کی کرویت اور زمین کی گردش اور سورج، چاند کی خلائی گردشیں کھل کر قرآن مجید نے بیان نہیں کیں جب کہ یونان کے حکما، ہندوستان کے مہندس، عراق و مصر کے ستارہ شناس سب قائل تھے کہ آسمان ایک بڑی اور ٹھوس چھت ہے جس میں چاند ستارے جڑے اور جُوے ہیں، اب اگر قرآن مجید اسی مفروضہ کو بیان کردیتا تو اب کتنی بحثیں چھڑ جاتیں اور قرآن مجید کا اصل مقصد یعنی ہدایت پس پشت چلا جاتا، اس لیے حکمت خداوندی یہی تھی کہ ایسا اعجازی طریقہ کلام اختیار کیا جائے جس سے ہر زمانے

(۱) افتتاحیہ (۱) طبع ثانی، ص ۱۳۔ (۲) ایضاً، ص ۱۴۔ (۳) ایضاً۔

کے دعووں اور مسلمات کے مطابق مطلب نکل سکے۔

اس سلسلے میں مولانا کا یہ نقطہ نظر بھی ذہن میں رکھنے والا ہے کہ سائنس اور ایک سائنس پر ہی کیا موقوف ہے، ریاضی کے ممکن استثنا کے بعد سارے ہی دنیوی علوم وفنون کا یہ حال ہے کہ ان کی یافت اور تحقیق برابر بدلتی رہتی ہے، ثبات و قرار کسی کو نہیں، اسی مسلسل بے ثباتی کا نام ان علوم کی ترقی اور ارتقا رکھ دیا گیا ہے، نظریات و ظنیات ہی نہیں ان علوم کے بڑے بڑے مقبول و معروف مسلمات و قطعیات تک ہر تھوڑی مدت گزر جانے پر کچھ سے کچھ ہوجاتے ہیں۔

اسی لیے مولانا کا بار بار اصرار ہے کہ مفسر کی نظر علوم طبعی و فلکی میں جتنی گہری ہوگی اس کو حکمت و صنعت تکوینی کے دلائل و شواہد بھی اتنے ہی ملتے جائیں گے، قرآن مجید میں دریا، پہاڑ، شجر و حجر، جمادات و نباتات اور حیوانات کی پیدائش کا جہاں جہاں ذکر ہے ان کی تعیین و تحقیق نے کتنے ہی سائنسی علوم کے دروازے کھول دیے ہیں، یَتَفَکَّرُوْنَ، یَفْقَهُوْنَ، تَعْلَمُوْنَ کی تفصیل اور تاکید سے مولانا کے نزدیک منطق اور استدلالات فکری کی طرف رہنمائی مقصود ہے۔

ایک جگہ مولانا نے قرآنی الفاظ کی لچک کے بارے میں لکھا کہ مثلاً اللہ پانی کا برسانے والا ہے، یہ قرآنی حقیقت آج بھی صحیح اور یقینی ہے، جب یہ معلوم ہوچکا ہے کہ سورج کی حرارت سے سمندر کے پانی سے بھاپ اٹھتی ہے، اوپر چڑھتی ہے، منجمد ہوکر خاص کثیف بادلوں کی شکل اختیار کرتی ہے پھر حرارت اور رطوبت ایک خاص درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو یہ بادل بوند بوند ہوکر زمین پر گرنے لگتے ہیں، یہ حقیقت اس وقت بھی پوری طرح صحیح اور یقینی تھی جب یہ کچھ معلوم نہ تھا اور انسان صرف اتنا جانتا تھا کہ بادل ایک قسم کے جانور ہیں جو سمندر سے پانی پی کر آسمان پر چلے جاتے ہیں اور آسمان پر پانی کے ذخیرے جمع رہتے ہیں جیسے دنیا میں لوگ ٹینکوں میں پانی جمع کرلیتے ہیں، اس صورت حال کا راز صرف یہ ہے کہ قرآن نے غیب کی باتوں کا تو پورا اور کافی علم اپنے اندر دے دیا، اللہ، روح، وحی، فرشتے، جنت، دوزخ کے متعلق تو ساری تفصیل بیان کردی، اس لیے کہ ان ماوراء عقلیات کے علم کا کوئی قابل اعتماد ذریعہ بجز وحی الٰہی اور آسمانی کتابوں کے ممکن نہیں، باقی جتنے علوم وفنون کا تعلق ان کی عقل و دماغ سے ہے اور جن کو فلسفہ یا سائنس کہیے ان کی جزئی تفصیلات کی طرف تو قرآن گیا ہی نہیں، اعجاز قرآنی یہی ہے کہ سائنس

تحقیقات جو کچھ بھی ہوں، قرآن ان علوم عصری سے ٹکراتا نہیں بلکہ ہر دور میں ان کے ہم آہنگ ہی دکھائی دیتا ہے۔

مولانا دریابادی کا یہی عقیدہ اور ان کا یہی انداز فکر پوری تفسیر میں نظر آتا ہے، پوری تفسیر کی وضاحت بھی کردوں کہ میں نے تفسیر ماجدی کی صرف تین جلدوں کو دیکھا ہے، ادارۂ تحقیقات ونشریات اسلام کی یہ اشاعتیں بالکل جدید ہیں، سورہ الفرقان تک کی سورتیں ان میں آگئی ہیں، باقی اگلی جلدیں شاید ابھی شائع نہیں ہوئی ہیں یا اگر شائع ہوئی ہیں تو وہ ہم کو مل نہیں سکیں، بہرحال ہم نے تین جلدوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور کوشش کی کہ موضوع کی مناسبت سے ان حاشیوں کو دیکھا جائے جن کا تعلق سائنسی انکشافات وغیرہ سے ہے، اگر تاریخ، جغرافیہ اور آثار قدیمہ اور تقابل صحف کو اس میں شامل کرتا تو پھر یہ مطالعہ بہت دراز ہوجاتا، اس مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کہ مولانا نے جدید تحقیقات کی تفصیل دینے سے گریز کیا ہے، وہ صرف اشارہ کرکے اصل مقصد کو واضح کرنا چاہتے ہیں، اختصار، مولانا کی تحریر کی خاص خوبی ہے، تفسیر میں بھی یہی خوبی نمایاں ہے البتہ جامعیت سے کوئی خالی نہیں، مثلاً:

آیت وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ (۲:۲۲) کے تحت لکھتے ہیں:

"قرآن مجید کا کام مسائل طبیعیات، فلکیات، جغرافیہ وغیرہ کی تعلیم دینا نہیں بلکہ ان عالم گیر مشرکانہ عقائد اور جاہلی تخیلات کی تردید ہے، کائنات میں جو کچھ ہے تمام تر قادر مطلق ہی کی کارفرمائی کا ثمرہ ہے"۔

بہٖ یعنی پانی کے واسطے اور ذریعے سے۔

لکھتے ہیں "پانی خصوصاً بارشی پانی کو جو دخل ہر قسم کی زمینی پیداوار اور نباتات سے ہے اور پھر بالواسطہ اور براہ راست بھی حیوانی اور انسانی زندگی کے قیام و بقا میں ہے ان سب کی تفصیل اگر لکھی جائے تو بجائے تفسیر قرآن کے ایک ضخیم سائنسی مقالہ تیار ہوجائے"۔

ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (۲:۲۹) کے تحت لکھتے ہیں:

"مرتبہ انسانی کا یہ شرف و احترام اسلام کا ہی قائم کیا ہوا ہے، ڈارون کے ترقی یافتہ

بندر غریب کو اس رتبہ و مقام سے کیا واسطہ، ارتقاء کائنات کا اصل اصول بالکل صحیح مان لیا جائے جب بھی اس کی ڈارونی تعبیر کی گم راہی تو بہ دستور رہے گی"۔

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ (۲:۲۹):

"قدیم اہل ہیئت نے سات آسمانوں سے مراد سات مشہور سیاروں کے مدار لیے ہیں ...... جدید ترین فلکیاتی تحقیق کے مطابق جو بھی تشریح کی جائے قرآن سے باہر نہیں بلکہ قرآن کے اندر ہی ہوگی"۔

اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً (۲:۳۰)

"......انسان مادی مشینی ترقیاں جتنی بھی کرتا جائے گا وہ سب شواہد اس کی اسی خلافت تکوینی کے ہوں گے، یہ نت نئے ایجادات وانکشافات، اس کی فلاح روحانی اور نجات اخروی کے نقطہ نظر سے جتنے ہی لاحاصل ہوں وہ عبث اور بے کار ہوں، بہرحال ہیں سب اس کی خلافت تکوینی کے ہی مظاہر"۔

وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲:۳۶)

......مسئلہ ارتقا کے علم برداروں نے جس قانون تنازع للبقا پر اتنا زور دیا ہے ہوسکتا ہے کہ اس میں ایک پرتو اسی حقیقت قرآنی کا آگیا ہو۔

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ (۲:۵۰)

البحر سے مراد یہاں دریائے نیل نہیں جیسا کہ بعض ثقات کو دھوکا ہوگیا ہے بلکہ بحر قلزم یا بحر احمر مراد ہے، دریائے نیل تو بنی اسرائیل کے مسکن اور محلہ سے مغرب جانب واقع تھا اور اسرائیلیوں کا راستہ شام کے لیے مشرق کی طرف تھا، نیل سے اس راستے کو دور کا بھی واسطہ نہ تھا، مصر سے شام کی راہ کے قریب بحر قلزم تھا، اسی کے تنگ شمالی سرے کی جانب یہاں اشارہ ہے، مصر کے مشرق میں جہاں بعد کو نہر سوئز کھدگئی اور پہلے خشکی تھی، اس سے متصل جنوب میں سمندر دو مثلثوں کی شکل میں تقسیم نظر آئے گا، یہاں ان دو میں سے مغربی مثلث مراد ہے، اسرائیلیوں نے اسی کو عبور کرکے جزیرہ نمائے سینا میں قدم رکھا تھا۔

اِثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا (۲:۶۰)

یعنی اس پہاڑی چشمہ سے بارہ دھارے یا بارہ ٹوٹیاں الگ الگ جاری ہوگئیں، بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کی تعداد کے عین مطابق، بعض نادان مسیحیوں نے اس تعداد پر اعتراض کردیا کہ یہ تو بائبل میں موجود نہیں، قرآن نے کہاں سے گڑھ کر کہہ دیا، قدرت نے سوال کا جواب بھی مسیحیوں کی زبان سے دلوادیا، جارج سیل نے اسی آیت کے حاشیے پر لکھا، ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے بہ تصریح بیان کرتا ہے کہ چٹان سے پانی بارہ مقامات سے نکلتا تھا، ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ ہے:

چٹان میں اس وقت چوبیس سوراخ موجود ہیں جو بہ آسانی شمار کیے جاسکتے ہیں، بارہ ایک طرف ہیں اور بارہ ان کے مقابل جانب۔

پادری ڈین اسٹینلی نے جو انیسویں صدی میں مسیحیت کے ایک ممتاز رکن ہوئے، صدی کے وسط میں بائبل کے مقامات مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لیے فلسطین اور اس کے ملحقات کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات وتحقیقات پر ایک مستقل کتاب SINAI AND PALESTINE کے نام سے شائع کی، اس میں اس چٹان کا ذکر کرکے لکھتے ہیں:

یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے، آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور لیجا کی وسیع وادی میں واقع ہے، شگاف اور درار جابجا پڑے ہوئے ہیں، کچھ مٹے ہوئے ہیں کچھ بڑے ہیں، کچھ چھوٹے، گنتی میں اگر سب کو لیا جائے تو بیس ہوتے ہیں، اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس، سب سے پہلے قرآن ہی نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لیے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے، یہ اشارہ ان ہی شگافوں کی طرف ہے۔ (ص ۲۷-۳۶)

عرب کے امی کی لائی ہوئی کتاب کے اعجاز کے قربان جائیے، صدیاں گزر جانے پر اس کے بیان کی جزئیات تک کی تصدیق ہورہی ہے اور وہ بھی منکرین ومعاندین کی زبان سے۔

اِهْبِطُوْا مِصْراً (۲:۶۱)

مصراً کوئی شہر، یہاں مراد جزیرہ نمائے سینا یا اس کے مضافات کا کوئی آباد شہر ہے مصر کے لفظی معنی شہر کے ہیں جس کی حد بندی ہوچکی ہو اور یہاں تنوین کے ساتھ کھلا ہوا اسم نکرہ ہے لیکن بڑے بڑے فاضل انگریز مترجمین نے بے کھٹکے اس کا ترجمہ ملک مصر کرڈالا ہے۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ (۲:۶۱)

میں ھم کی ضمیر کا مرجع مولانا نے الیھود یا الذین ھادوا کو نہیں مانا ہے بلکہ بنی اسرائیل کو مانا ہے جو متعین قوم ونسل ہے، معلوم ہوا کہ ذلت کی حامل ایک مخصوص نسل وقوم ہے نہ کی کسی مخصوص مذہب وملت کے پیرو۔

يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ (۲:۹۶)

کے تحت لکھا کہ ایک عجیب بات اسی سلسلے میں یہ ہے کہ تطویل عمر کے جو عجیب عجیب نظریے آج یورپ میں قائم ہورہے ہیں اور طرح طرح کی تدبیریں اور نسخے اس کے لیے ایجاد ہورہے ہیں، ان میں پیش پیش جو ڈاکٹر اور اہل سائنس ہیں وہ عموماً یہودی ہیں۔

كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ (۲:۱۱۶)

میں لکھا کہ بڑی یا چھوٹی وحشی یا ترقی یافتہ کس مخلوق کی مجال ہے جو اللہ کے بنائے ہوئے دن اور اللہ کی بنائی ہوئی رات کی چوبیسوں گھنٹوں کے علاوہ کوئی گھنٹہ، کوئی منٹ، کوئی لمحہ اپنے لیے پیدا کرسکے، بڑے سے بڑے ماہرین سائنس میں سے کسی کے امکان میں ہے کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی فضائے کائنات سے باہر ایک گز، ایک فٹ، ایک انچ جگہ اپنے لیے تلاش کرسکے؟ کون ایسا ہے کہ اللہ نے زمان اور مکان کی جو حدیں مقرر کردیں ہیں، ان سے قدم باہر نکال سکے، کون ایسا ہے جو اس کے خلق کیے ہوئے قانون حرارت برودت ورطوبت سے بے نیاز رہ سکے، کون ہے جو اس کے باندھے ہوئے قانون کشش اجسام سے بغاوت کرسکے، عدد، وزن، مقدار کے جو ضابطے خدا نے مقرر کر رکھے ہیں، کسی میں اتنی ہمت ہے کہ گنجائش ان سے عدول وانحراف کی پاسکے، بڑے سے بڑے موجد، بڑے سے بڑے صناع کا کمال بجز اس کے کیا ہے کہ اس نے نظام تکوینی کے ضابطوں اور قاعدوں کی مزاج شناسی میں کمال پیدا کرلیا ہے اور مسبب الاسباب کے حضور میں وہ دوسروں سے بڑھ کر بندہ قانت ہے۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲:۱۶۴)

میں السحاب کے تحت ایک طویل حاشیے کے آخر میں لکھا کہ "جاہلی اور غیر مومن قوموں کے فلسفہ اور سائنس کا صرف نقطہ نظر غلط ہوتا ہے، اس کی اگر تصحیح ہوجائے اور ان علوم مادی کا

مطالعہ اگر ایمانی نقطہ نظر سے کیا جائے تو بجائے الحاد، ارتیاب وتشکیک کے عرفان و ایقان کی راہیں روز بہ روز روشن تر ہوتی جاتی ہیں۔

اَلشَّھْرُ (۱۸۵:۲)

اس دنیا کے پردے پر کچھ ملک ایسے بھی آباد ہیں جہاں کا طلوع وغروب ہمارے معیار کے لحاظ سے بالکل غیر معمولی ہے، مثلاً فن لینڈ یا قطبین کے قریب کے علاقے جہاں رویت ہلال کے انتیسویں یا تیسویں دن کے واقع ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں اور جب یہ نہیں تو وہاں شہود الشہر یعنی طلوع ماہ رمضان کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، قرآن مجید کے اس اعجاز بلاغت کے قربان جائیے کہ صرف ایک لفظ شہد الشہر کے لے آنے سے کتنے سوالات اور شبہات کی جڑ کاٹ دی، بہ طور تطوع یا بہ خیال تقوی کوئی وہاں بھی روزہ رکھنا چاہے تو سونے جاگنے، کھانے پینے، غرض دنیا کے اور سارے کاروبار کے لیے وہاں اوقات کا جو معیار ہو اسی انداز اور حساب سے روزہ بھی رکھ سکتا ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا قول بھی نقل کیا ہے کہ:

"ان غیر معمولی منطقوں کے لیے وہی اوقات سحر وافطار ہوں جو معمولی منطقے کے انتہائی اوقات سحر وافطار ہو سکتے ہیں"۔

وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ (۱۸۷:۲)

کے تحت ضبط تولید کے نقصانات کو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے حوالوں سے دکھانے کے بعد لکھا کہ سائنس کے ماہرین نے اس جدید فیشن کی لغویت اور بے ہودگی پر اس سے بھی زیادہ کھلے لفظوں میں کہا ہے اور اس کی طبعی مضرتیں کھول کر دکھائی ہیں خصوصاً عورت کے حق میں۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ ...... لِاُوْلِی الْاَلْبَابِ (۱۹۰:۳)

میں لکھتے ہیں کہ نظام فلکی اور اس کی تفصیلات چاند، سورج، ستاروں کی تعداد، ان کے درمیانی فاصلے، ان کے باہمی تعلقات وتاثرات، ان کی گردشوں کی پیائش، گہن کے اسباب و اوقات، ان کے طلوع وغروب، نور وحرارت وغیرہ کے قاعدے، ضابطے اس قسم کی تفصیلات سے علم ہیئت کی کتابوں کے دفتر کے دفتر بھرے پڑے ہیں، رہی زمین تو ہیئت ارض، مساحت ارض،

طبقات ارض، معدنیات ارض، کشش ارض، ہواؤں اور موسموں کے تغیرات وغیرہ کے لیے تو کوئی پورا فن بھی کافی نہیں ہوا بلکہ جغرافیہ، جغرافیہ طبعی، جیالوجی، فزالوجی، میٹرولوجی، آرکیالوجی، خدا جانے کتنے فنون پر فنون نکلتے چلے آرہے ہیں اور حکمت باری اور صنعت باری کے اندازے اور تخمینے ختم ہونے کے قریب بھی نہیں آرہے ہیں۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا (۱۹۱:۳)

کائنات کے ان عظیم الشان موجودات کے قوانین طبعی اور قوانین تکوینی سے صانع اعظم وخالق عالم کی قدرت، حکمت، صنعت پر استدلال کرتے رہنا عبادت ہی نہیں ایک اعلا و اشرف عبادت - کاش آج ہماری قوم کے ماہرین فن ہیئت، فلکیات، ریاضیات وغیرہ علوم طبعی پر دینی وایمانی نقطہ نظر سے قلم اٹھاتے۔

فَالِقُ الْاِصْبَاحِ ...... اَلْعَزِیْزُ الْعَلِیْمِ (۱۸۵:۶)

یہ سارا عظیم الشان کارخانہ حیات، یہ نظام ارضی ونظام فلکی، اس کے قانون کے مطابق اور اس کے ضابطے کے تحت چل رہا ہے، حسبانا یعنی مصالح خلق کے بالکل متناسب، ایسے حساب کے مطابق جس میں نہ کمی کا احتمال ہے نہ زیادتی کا، اعلا سے اعلا سائنسی قانونوں، ضابطوں کے ماتحت۔

ھُوَ الَّذِیْ ...... نَفْسٍ وَّاحِدَۃٌ (۹۸:۶)

من نفس واحدہ، یہاں وحدت انسانی کو بہ طور ایک حقیقت کے بیان کیا ہے اور اس مسئلہ کو صاف کیا ہے کہ سب نوع انسانی کا مورث اعلا ایک ہی ہوا ہے کئی نہیں ہوئے ہیں، جیسا کہ بعض ناقص فلسفیوں اور بعض باطل مذہب والوں نے خیال کیا ہے۔

اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ (۱۱۶:۶)

وحی الٰہی کے نور مبین اور علم قطعی کے علاوہ دنیا میں عقل اور علوم کے نام سے جو کچھ بھی ہے وہ ارسطو کی منطق ہو چاہے کانٹ کے مقولات، سب ظن وتخرص ہی کے حکم میں داخل ہیں۔

وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ (۱۵۱:۶)

میں برطانیہ کے ماہر معاشیات مالتھس کی تردید ہے۔

یَوْمَ یَاْتِیْ بَعْضُ آیَاتِ رَبِّکَ (۱۵۸:۶)

قرب قیامت کی نشانیاں مثلاً آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا، اس کو ہیئت وفلکیات کے کسی قاعدے کے تحت محال قرار دینا بجائے خود ایک جہالت ہے، ہیئت وفلکیات کے تو جتنے بھی قوانین ہیں سب موجودہ نظام تکوینی ہی کے ماتحت ہیں لیکن جب یہ نظام خود ہی شکست ہوجائے گا تو اس کے کسی مخصوص جزیے کے باقی رہ جانے پر اصرار سراسر بے معنی ہے۔

وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِ نِالْحَقُّ (۸:۷)

یومئذ، قیامت، وہ دن تو کشف حقائق کا ہوگا کیا یہ ممکن نہیں کہ اعمال میں وزن تو آج بھی ہو لیکن آج ہمارے قوی کے لیے غیر مدرک ہو اور اس روز جب ہمارا ادراک خود ہی سوگنا اور ہزار گنا بڑھ چکا ہوگا، اعمال کی یہ کیفیت بھی ہمارے علم وشعور میں آنے لگے، بارکلے برطانیہ کے مشہور فلسفی نے ثابت کیا ہے کہ مادہ کے جتنے بھی اغراض تسلیم کیے گئے ہیں ان کی اصل تو ان کی محسوسیت ہی ہے، اگر وہ سرے سے کسی کو محسوس ہی نہ ہوں تو ان کے وجود ہی کے کوئی معنی نہیں، اعمال کی صفت وزن آج ہمارے موجودہ قوی کے لیے غیر محسوس ہے، کل ہمارے ترقی یافتہ قوی کے لیے محسوس ومدرک ہوگی۔

سِتَّةِ اَیَّامٍ (۵۴:۷)

یوم سے مراد ظاہر ہے کہ یہ متعارف یوم ۲۴ گھنٹوں والا تو ہو نہیں سکتا کہ یہ خود نتیجہ ہے، حرکت ارضی کے اور یہاں بیان اس وقت کا ہو رہا ہے جب یہ چاند، سورج، زمین، آسمان سرے سے موجود ہی نہ تھے بلکہ مراد یہاں مطلق زمانہ ہے، یعنی چھ مختلف زمانوں میں چھ مرحلوں میں یا چھ مراتب وجود کے ساتھ۔

کَذٰلِکَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰی لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ (۵۷:۷)

یعنی یہ تکوینی داستان اس لیے سنائی گئی کہ تم اس مشاہدہ فطرت سے توحید الٰہی اور مردوں کے زندہ اٹھا کرنے کی قدرت پر استدلال کرسکو، اسباب نزول بارش اور اس کے سارے مراتب کی تفصیل اگر کی جائے تو یہ تفسیر خود ایک سائنسی مقالہ بن جائے لیکن قرآن مجید کا مقصود کسی درجے میں بھی مسائل طبیعیات کی تعلیم نہیں۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَاءً وَّ الْقَمَرَ نُوْراً (۵:۱۰)

ضیاء وہ روشنی جو اپنی ذاتی مستقل ہو، نور وہ روشنی جو ضیاء سے مستعار ہو، اس کا انعکاس ہو، ضیاء اور نور کے فرق پر" قرآن مجید نے چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے عرب کے ایک امی کے لائے ہوئے قرآن نے دو لفظ الگ الگ لاکر جدید سائنس کے اس بیان پر مہر تصدیق لگادی کہ چاند بذات خود بے نور، اس میں چمک دمک جو کچھ ہے وہ سورج کے عکس سے ہے۔

لِقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ (۶:۱۰)

سائنس نام ہی ہے ہر موضوع کے متعلق ترتیب وانضباط کے علم کا اور گردش شب وروز اور تمام اسباب موجودات میں ہر علم وفن کے ماہر فلکیات، طبعیات، حیوانیات وارضیات وغیرہ میں جو اپنے ہر فن سے متعلق قاعدوں، ضابطوں اور حسن ترتیب کی ہر دم فکر کرتے رہتے ہیں، ان کو اللہ کی خلاقی، حکمت وصناعی کا سب سے بڑھ کر قائل ہونا چاہیے۔

کُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّی (۲:۱۳)

ہر ایک کی میعاد مقرر ہے، ایک منزل معین ہے، ہر ایک کے قوانین منضبط ہیں اور ایک عجیب بات ہے کہ سائنس کی جتنی ترقی ہوتی جاتی ہے، فلکیات کے قاعدے، ضابطے، اجرام فلکی کے باہمی فاصلے، ان کی رفتار کے حساب وکتاب سب سے زیادہ منضبط نظر آنے لگتے ہیں، قرآن مجید نے ان ہی کو آیات الٰہی ٹھہرایا ہے، ان کی جزئی تفصیلات میں گئے بغیر اور وہ تفصیلات تو ایسی ہیں کہ ان کی تحقیقات کا سلسلہ برابر پھیلتا ہی چلا جاتا ہے اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ حرف آخر ان کے باب میں کب اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

وَمِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ (۳:۱۳)

سائنسی تحقیقات سے آج یا آگے چل کر جس جس قسم کا بھی تعلق اور جہت پھلوں کے درمیان منکشف ہو سب آیت کے تحت آجائے گا۔

مَدَّ الْاَرْضَ (۳:۱۳)

زمین کی سائنسی شکل جو کچھ بھی ہو قرآن کو اس سے مطلق بحث نہیں، بشری آنکھ کو تو بہر حال پھیلی ہوئی سطح ہی نظر آتی ہے اور آسمان جس طرح سب سے اونچی چھت کا نام ہے زمین

پیر کے نیچے کے فرش کا نام ہے۔

سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهَارَ (۳۳:۱۴)

سَخَّرَ لَكُمُ، سائنسی ایجادات وانکشافات آج جتنے بھی ہوتے جارہے ہیں سب انسان کی مادی عنصری، تسخیر کائنات ہی کے شواہد ہیں۔

سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ (۳۳:۱۴)

یہ شمس وقمر کی تسخیر کیا معنی اور آج سے ۱۴ سو سال قبل اس کا اعلان کس کی سمجھ میں آنے والی بات تھی، اب جاکر معلوم ہوا کہ انسان چاند تک رسائی حاصل کرسکتا ہے، یہ کتاب الٰہی ہی ہے جس نے بے دھڑک یہ اعلان تسخیر قمر کردیا تھا اور تسخیر شمس بھی اب محال نہیں معلوم ہورہی ہے۔

شِهَابٌ مُّبِيْنٌ

اہل سائنس کی تحقیق ہے کہ فضا میں بڑے بڑے وزنی پتھر چکر کھایا کرتے ہیں اور وہ ہوا سے رگڑ کھا کر روشن ہوجاتے ہیں اور کبھی زمین پر ٹوٹ کر گر پڑتے ہیں، انہیں قرآنی شہاب مبین وشہاب ثاقب سے اصلاً تعلق نہیں، قرآن کے شہابوں کا تعلق تمام تر فرشتوں اور شیطان سے ہے جو سرتاسر غیبی چیزیں ہیں۔

وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْ حِلْيَةٍ (۱۴:۱۶)

ایک خبر دی ہے کہ ۶۵ کو روسی سائنس اکاڈمی کے ممبر مسٹر زنکرچ نے بیان دیا کہ دنیا کے سمندروں میں سونے چاندی نکل اور دوسری نایاب دھاتوں کی بے پایاں مقدار موجود ہے، اندازہ ہے کہ سونا ۸۰ لاکھ ٹن، چاندی ۱۶ کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن، نکل ۸ کروڑ ٹن موجود ہے۔

۱۴۰۰ سال قبل عرب یا کسی ملک کا بڑے سے بڑا دانش ور بھی اس صورت حال کا تصور کرسکتا تھا؟

وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً (۳۳:۱۴)

ان گھریلو جانوروں کی ساخت وپرداخت اور ان کے اعضا کے افعال میں جو صدہا عجائب ہیں، تفصیلات، بیالوجی اور زولوجی کے ہر متعلم پر روشن ہیں۔

☆☆☆☆

عراق

از:- کلیم صفات اصلاحی☆

جائے وقوع: مغربی ایشیا کی عربی مملکت عراق کے مشرق میں ایران، شمال میں ترکی، مغرب میں شام واردن اور جنوب میں سعودیہ عربیہ، کویت اور خلیج فارس واقع ہے(۱)، ترکی سے ایران کی دوسو، ایران سے ایک ہزار، کویت سے ڈھائی سو، سعودی عرب سے ایک ہزار، شرق اردن سے ڈیڑھ سو، شام سے چھ سو اور جنوب مشرق میں تقریباً پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

رقبہ وآبادی: عراق کا کل رقبہ ۴۳۷۲۷۰ مربع کلومیٹر یعنی ۱۶۸۸۶۹ مربع میل ہے(۲)، ۱۹۷۲ء کے اعداد وشمار کے مطابق وہاں کی کل آبادی ایک کروڑ دو لاکھ پچاسی ہزار تھی (۳) جو اب بڑھ کر دو کروڑ ۳۱ لاکھ ہوگئی ہے مگر عراق پر امریکی حملے کے بعد اس کے باشندوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا بہت مشکل ہوگیا ہے۔

باشندوں کی موجودہ نوعیت: عراق اصلاً عرب ملک ہے جو عراق عرب بھی کہلاتا ہے، یہاں ۷۹ فیصد عرب باشندے ہیں، ۳ فیصد ایرانی النسل اور ۱۶ فیصد کرد ہیں، بہت قلیل تعداد میں ترک وغیرہ بھی آباد ہیں، عراق میں ۹۶٪ آبادی مسلمانوں کی ہے، جن میں سنی مسلمان ۳۴ فیصد اور شیعہ ۶۳ فیصد ہیں، بقیہ ۳ فیصد عیسائی اور دوسرے مذاہب کے پیرو ہیں، اسرائیل کے قیام کے بعد عراق میں سکونت پذیر یہودی، اسرائیل منتقل ہوگئے، عرب مسلمان شیعہ سنی مکتب فکر میں منقسم ہیں (۴)، عراق کے جنوبی حصے میں شیعہ مسلمان سنیوں کے مقابلہ میں زیادہ اور شمالی حصہ میں سنیوں کی تعداد زیادہ ہے، شمال مشرقی حصے میں کرد مسلمان سب کے سب سنی ہیں، یہ عجیب بات ہے کہ عراق میں شیعوں کی اکثریت کے باوجود صدر عراق کی پھانسی کے وقت تک

☆ رفیق دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ۔

اقتدار سنی مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا اور حکومت میں شیعوں کی نمایندگی کم تھی مگر اس وقت وہاں صدر اور وزیر اعظم دونوں شیعہ ہیں۔

قدیم نام: توراۃ کے بیان کے مطابق عراق کا سب سے قدیم عبرانی نام ارم نہرائیم یعنی دونہروں یا دریاؤں کا علاقہ تھا، اس کے بعد یونانی بادشاہ سکندر کے عہد میں اس کو میسوپوٹیمیا (دوآبہ) کہنے لگے، میسوپوٹیمیا دو یونانی لفظ میسو اور پوٹیمیا سے مرکب ہے، جس کے معنی ”درمیان اور دریا“ کے ہیں، اس طرح اس مرکب لفظ کے معنی ایسے علاقے کے ہیں جو دو دریاؤں کے درمیان واقع ہے (۶)، میسوپوٹیمیا نام سے پہلے اس کا شمالی حصہ اسیریا اور جنوبی بابل کے نام سے معروف تھا اور اس سے بھی پہلے یعنی پانچ چھ ہزار سال قبل مسیح بابل کا علاقہ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا، شمالی حصے کو اکد اور جنوبی حصے کو سومر کہتے تھے، دراصل اکد اور سومر دجلہ و فرات کے درمیانی دوآبے کا نام تھا (۷)، نویں صدی قبل مسیح دوآبہ دجلہ و فرات کو ”کلدہ“ کے نام سے جانا جاتا تھا (۸)، عراق کا پہلا سریانی نام سورستان ہے جن کا انتساب سریانیوں کی جانب ہے، یاقوت نے حمزہ کی کتاب التصحیف کے حوالہ سے لکھا ہے کہ سریانی کی نسبت جس سورستان کی طرف کرتے تھے، وہ ارض عراق و بلاد شام ہے (۹)، ایرانی بادشاہوں کے عہد میں عراق ”دل ایران شہر“ کے نام سے مشہور تھا جس کا ترجمہ ابن خرداذبہ نے ”عراق کا دل“ کیا ہے (۱۰)، ابن رستہ کے بیان کے مطابق پورے ایران شہر کو انسانی جسم سے تشبیہ دے کر ”سواد (عراق) کو قلب ایران شہر کے نام سے جانا جاتا تھا (۱۱)، اہل عرب میسوپوٹیمیا کے شمالی حصہ کو ”الجزیرہ“ اور جنوبی حصے کو عراق یعنی ”ساحل سمندر“ یا ”دامن کوہ“ کا نام دیتے تھے (۱۲)۔

عراق کا نام سواد اور اس کی وجہ تسمیہ: عراق کو السواد (سیاہ یعنی زرخیز ملک) بھی کہتے تھے، یہ دراصل ایک اصطلاحی لفظ ہے جس کے معنی عربوں کے نزدیک ملک کا وہ حصہ جو دو دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے، اسی لیے عربوں کی اکثریت اس نام کا اطلاق پورے عراق یعنی بابل کے تمام ہی علاقوں پر کرتی تھی (۱۳)، لیکن اس کے علاوہ اس لفظ کا ایک دوسرا معنی ”گردونواح“ بھی ہے، اسی وجہ سے سواد کوفہ و سواد بصرہ کی اصطلاح بھی مروج ہے، اس کے برعکس وزیر ابوالحسن ابن الفرات نے عراق کے سواد نام کی ایک دل چسپ وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ حضرت عمرؓ کے

دور خلافت میں جب عرب فاتحین وہاں پہنچے تو نخلستان اور گھنے جنگلات کی کثرت اور پانی اور کھیتوں کی بہتات کے سبب انہیں وہاں دن میں بھی اندھیرا نظر آیا تو کہا کہ ”ماھذا السواد“، اسی وقت سے اس علاقے کو ”سواد“ عراق کہنے لگے (۱۴)، اصطخری اور ابن حوقل نے اپنی کتابوں میں بلخی کا یہ بیان جو عام خیال اور صحت سے زیادہ قریب ہے نقل کیا ہے کہ بغداد اور کوفہ کے درمیان سواد نام کا ایک علاقہ ہے جس میں کھیتوں کا جال بچھا ہوا ہے اور اس میں کوئی خلا نظر نہیں آتا (۱۵)، اسی وجہ سے بعد میں پورے عراق کا نام سواد پڑ گیا۔

عراق کے معنی اور اس کی وجہ تسمیہ: سطور بالا میں ذکر ہو چکا ہے کہ میسوپوٹیمیا کے جنوبی حصہ کو عربوں نے عراق کا نام دیا تھا، عراق کے معنی اور اس کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں عرب مصنفین کے متضاد بیانات کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے گو کہ یہ معنی آفرینیاں صحیح نتائج کے اعتبار سے شکوک و شبہات کے دائرے میں آجاتی ہیں تاہم افادیت اور دل چسپی سے خالی نہیں ہیں، ابن الاعرابی کے بہ قول نجد کے نشیب اور سمندر سے قریب ہونے کی بنا پر اس کو عراق کا نام دیا گیا، خلیل نے اس کے معنی ساحلی علاقہ کے بتائے ہیں، ایک خیال یہ بھی ہے کہ عراق عرقہ کی جمع ہے اور عرقہ ایک قسم کا پرندہ ہے، قطرب کے بہ قول عراق کو عراق سمندر سے قریب ہونے اور اس میں سایہ دار درختوں اور ویران زمین ہونے کے سبب کہا گیا (۱۶)، ایک خیال یہ بھی ہے کہ اس علاقہ پر اس لفظ کے اطلاق کی بہ ظاہر کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ممکن ہے یہ لفظ قدیم نام سے معرب کیا گیا ہو جو اب معدوم ہو چکا ہے اور شروع میں اس کے معنی کچھ اور ہی رہے ہوں۔ (۱۷)

عراق کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں اس قدر اختلاف کے اسباب کا پتہ لگانا سخت مشکل ہے، چوں کہ عراق کے لغوی معنی ساحل کے قریب شاداب چراگاہ یا علاقہ کے آتے ہیں (۱۸)، اور میسوپوٹیمیا (عراق) دجلہ و فرات کے ساحل پر واقع ہے، اسی لیے ممکن ہے کہ عرب مسلم فاتحین نے اس علاقہ کو عراق کا نام دے دیا ہو۔

عراق کی قدیم جغرافیائی و طبعی حالت: کسی ملک کی تاریخ اور عہد ماضی میں اس ملک کے باشندوں کے شاندار کارناموں سے واقفیت کے لیے اس کے جغرافی اور طبعی حالات کا جاننا از حد ضروری ہے کیوں کہ طبعی جغرافیہ سے انسانی زندگی کا گہرا رشتہ ہوتا ہے، اس کرۂ ارض کی سطح،

محل وقوع، اس کی شکل وصورت، قدرتی مناظر ومعدنی ذخائر، آب وہوا، پانی کا مہیا ہونا، آب پاشی کے ذرائع اور نباتات وغیرہ کی موجودگی انسانی زندگی پر بلاشبہ اثر انداز ہوتی ہے (۱۹)، اس لیے اس سرزمین کی ہر نوع کی آبادی کے حالات وکوائف کے علم کے بغیر اس کی تمدنی، اخلاقی، سیاسی، علمی اور معاشرتی صلاحیتوں کا راز فاش ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے، قدیم زمانہ میں اس مقصد کے حصول کے لیے علم ہیئت وہندسہ سے مدد لے کر پتہ لگایا جاتا تھا کہ سیارہ کے لحاظ سے اس کرہ ارض کی کیا حیثیت ہے؟ نظام شمسی اور افلاک کا اس علاقے سے کیا تعلق ہے اور ان تمام اسباب سے وہ علاقہ کس درجہ متاثر ہے اس کے علاوہ علم طبقات الارض سے واقف ہونا بھی ضروری سمجھا جاتا تھا کہ اس زمین کے طبقات یا اس کے مختلف حصے کس کس زمانے میں کن کیفیتوں سے دوچار ہوئے ہیں اور ان حالات وکیفیات نے اس کرۂ ارض کے باشندوں کے طرز معاشرت اور طریقہ حیات پر کس قسم کے اثرات مرتب کیے ہیں اور بعد کے زمانوں میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں جن کا علم ہم کو تاریخ سے ہوا کیوں کر ہوئیں، جغرافیہ وتاریخ یہیں پہنچ کر ایک دوسرے میں ضم ہوجاتے ہیں، جغرافیہ اور تاریخ کے اس آپسی امتزاج وتعلق کی اہمیت کو پیش نظر رکھ کر ہی کسی ملک وقوم کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

عہد اسلامی کے باکمال جغرافیہ دانوں کے اسی قسم کے خطوط واشارات ہی فی الحقیقت وہ سرچشمے ہیں جن سے جدید دور میں سائنسی واختراعی اور تجرباتی دنیا نے استفادہ کرکے ایسے آلات وپیمانے تیار کرلیے ہیں جو کرۂ ارض کی آب وہوا کے خصائص حتیٰ کہ آثار قدیمہ کے زمانے کی تعیین میں ناقابل تردید شہادت بہم پہنچاتے ہیں اور ترقی کی راہوں پر گامزن ہیں، آئندہ سطور میں عراق کی طبعی وجغرافی حالت قدیم وجدید ماخذ کی روشنی میں پیش کی جائے گی۔

پانی انسانی زندگی اور زرعی پیداوار کے لیے بنیادی ضرورت ووسیلہ ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کے وہ ممالک جو قدیم تہذیب وثقافت کی عظیم الشان روایتوں کے پاسدار تسلیم کیے جاتے ہیں، وسیع اور کشادہ ندیوں کے دامن میں آباد ہیں، پانی کی بہتات اور آمدورفت کی سہولت کے سبب وہاں زراعت وتجارت کو فروغ ہوا، چنانچہ دریائے نیل کے کنارے مصری ثقافت، دجلہ وفرات کے کنارے بابلی، اشوری، سومیرین، یونانی ایرانی اور اسلامی تمدن، دریائے سندھ کے

دامن میں ہڑپا اور موہن جوداڑو وکلچر، گنگا جمنا کے کنارے آریائی تہذیب، دریائے جوانگ کی وادی میں چینی تہذیب کی جلوہ نمائیوں سے تاریخ کے صفحات روشن ہیں، دجلہ وفرات کے درمیان ونشیبی علاقہ جس کو یونانی میسوپوٹیمیا کہتے تھے، اپنی اسی جغرافیائی وطبعی خصوصیت کے سبب قدیم تہذیب وثقافت کا امین ہے، بالغ نظر مورخین ومحققین نے اس ملک کے جغرافی وطبعی حالات شرح وبسط سے لکھے ہیں، ذیل میں اسی کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس ملک کی قدیم تہذیب وثقافت کے پیچھے قدرتی، طبعی اور جغرافی اسباب کا احاطہ کیا جاسکے اور اس کے قدیم تاریخی وتہذیبی عروج کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

ملک عراق کے وجود وتعمیر اور اس کی فارغ البالی وخوش حالی میں چوں کہ دریائے دجلہ و فرات کا خاص رول ہے، اس لیے ان دونوں دریاؤں کے بہاؤ، وجود اور مختلف زمانوں میں ان کے بہاؤ میں تبدیلی وغیرہ سے متعلق اجمالی حالت پیش کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

دجلہ وفرات: عراق میں دو اہم ندیاں دجلہ وفرات ہیں اور یہی دونوں ندیاں ہی عراق کی سینکڑوں نہروں کے منبع اور اس کی شادابی وزرخیزی کا سبب ہیں اور یہ دونوں آرمینیا کی پہاڑوں سے نکل کر میدانی علاقوں داخل ہوجاتی ہیں اور الگ الگ خلیج فارس میں آکر گرتی ہیں، دجلہ و فرات کا موجودہ سنگم قرنہ سے جنوب کا سارا علاقہ سمندر تھا، بعد میں اس علاقہ نے خشکی کی صورت اختیار کرلی، مالک رام صاحب لکھتے ہیں کہ ان دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی سے ہر سال اوسطاً نوفٹ نئی زمین بن جاتی ہے اور ابوشہریں (قدیم شہر اریدو) کو خلیج فارس کے موجودہ ساحل تک ۱۳۰ میل کا علاقہ بننے میں سات ہزار سال لگے ہوں گے اور اس طرح عراق کی تاریخ ۵ ہزار قبل مسیح تک چلی جاتی ہے (۲۰)، عراق کا اکثر علاقہ دجلہ وفرات کے درمیان واقع ہے، ندیوں کے دونوں جانب کا کچھ حصہ ہموار میدان ہے جو سطح سمندر سے ۶۵۶ فٹ تک بلند ہے اور جنوب مشرقی سے شمال مغرب تک پھیلا ہوا ہے، اس مسطح علاقہ کے دونوں طرف پچھم میں زیادہ اور پورب میں کم ۱۲ ۱۳ فٹ بلند میدانی علاقہ ہے، مغرب میں شام، اردن اور سعودی عرب کی سرحد تک بڑا حصہ اور مشرق میں ایران کی سرحد ۳۲۸۱ فٹ مرتفع پٹی ہے، ۴۹۲۱ فٹ بلند مشرقی وشمالی علاقہ کا رقبہ بہت کم ہے، محققین کے مطابق دریائے فرات کوہ ارطاط سے نکل کر شام سے

گزرتا ہوا شمالی مشرق کی جانب سے عراق میں داخل ہو جاتا ہے اور قرنہ کے قریب دریائے دجلہ میں مل جاتا ہے اور یہ دونوں یہیں مل کر شط العرب کے نام سے جانے جاتے ہیں، فرات کی کل لمبائی ۲۳۷۵ کلو میٹر (۲۱)، یعنی تقریباً ۱۷۸۰ میل ہے، دجلہ کردستان (یعنی آرمینیا) کی پہاڑیوں سے نکل کر عراق کے میدانی اور ہم وار علاقوں کو سیراب کرتا ہوا دریائے زاب کلاں، زاب خورد، دیالہ وغیرہ دریاؤں کو اپنی آغوش میں سموئے بصرہ سے ۶۰ میل شمال میں قرنہ کے مقام پر دریائے فرات میں ضم ہو جاتا ہے۔

دجلہ وفرات کا سنگم: عہد وسطی یعنی پانچویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی تک عراق کی طبعی کیفیت موجودہ طبعی حالت سے بہت حد تک متغائر تھی، خلفائے سلف کے زمانے میں آب پاشی کی غرض سے بنائی گئی متعدد نہریں دجلہ وفرات کے بہاؤ میں تبدیلی کے سبب خستہ و بے نشان ہو گئیں، دجلہ کا موجودہ رخ جنوب مشرق کی طرف ہے اور بغداد کے جنوب میں قرنہ کے مقام پر دجلہ دریائے فرات سے مل جاتی ہے، بغداد اور قرنہ کے درمیان کی دوری بہ اعتبار خط مستقیم ۱۵۰ میل ہے لی اسٹرینج کے بیان کے مطابق مقام قرنہ دریائے دجلہ وفرات کا سنگم ہے، وہیں شط العرب کے نام سے ایک دریا عریض کھاڑی کی شکل میں بہتا ہوا خلیج فارس میں ضم ہو جاتا ہے، اس آب نائے کی لمبائی خط مستقیم کے اعتبار سے ۱۰۰ میل ہے۔ (۲۲)

عربوں کے زمانے میں دریا کی سب سے بڑی گزرگاہ موجودہ شط الحی کا علاقہ تھا، دجلہ شط الحی سے مشرق کی سمت بہتا ہے، قوت العمارہ سے اس کا راستہ الگ ہو گیا ہے (۲۳)، یہی راستہ ساسانیوں کے عہد میں بھی تھا (۲۴)، بلاذری کے بیان کے مطابق قباذ بن خسرو کے زمانے میں دریا کے دونوں جانب بندھے ہوئے بند غفلت اور بے پروائی کا شکار تھے جن کے سبب وہاں کے آباد علاقے سیلاب کی نذر ہو گئے تاہم اس کے بیٹے انوشیرواں کے عہد میں اس کی مرمت کی گئی، پھر خسرو پرویز کے زمانے میں ۶ یا ۷ھ مطابق ۶۲۸ - ۶۲۹ء میں فرات ودجلہ میں ایسی طغیانی آئی کہ دونوں دریاؤں کے بند اکثر جگہ سے ٹوٹ گئے اور آس پاس کا علاقہ تہِ آب ہو گیا تو خسرو پرویز نے ان کی مرمت میں انتہائی محنت اور بے دریغ دولت صرف کی (۲۵)، تاہم پانی سمٹ کر نہ جا سکا تو ماذرایا یعنی موجودہ قوت العمارہ کے علاقہ میں ایک وسیع کھاڑی وجود

میں آ گئی، ابن رستہ نے بھی اس وسیع مرداب کے وجود میں آنے کا زمانہ ساسانیوں کا بتایا ہے اور لکھا ہے کہ ساسانیوں کے آخری عہد میں دجلہ نے مشرقی راستہ چھوڑ کر مغربی راستہ (شط الحی والا) اختیار کر لیا تھا، جہاں مسلمانوں نے بعد میں شہر واسط تعمیر کیا (۲۶)، عہد اسلامی میں اس کھاڑی کے شمال میں واقع خشک زمینوں اور دجلہ وفرات کے کنارے واقع تمام علاقوں میں نہروں کا جال بچھا ہوا تھا، یہ نہریں مشرقی سمت بہہ کر دجلہ میں ضم ہو جاتی تھیں، دجلہ کے مشرق میں ۲۰۰ میل لمبی نہر نہرواں تکریت سے قدرے جنوب میں واسط سے پچاس میل کے فاصلہ پر ایران کی سمت واقع علاقوں کو سیراب کرتی تھی۔

عہد عباسی میں عراق کی سرسبزی وشادابی اور بحری تجارت، آب پاشی وآب رسانی کے ان ذرائع کی مرہون منت تھی، منصور نے بغداد آباد کرنے کے لیے دجلہ کے ساحل کا انتخاب اسی لیے کیا تھا کہ دجلہ وفرات کے راستہ سے دنیا کے تمام ملکوں سے بحری تجارت آسان تھی، بہ قول یعقوبی ”منصور نے یہ جگہ اس لیے پسند کی تھی کہ یہ دجلہ وفرات کے درمیان ایک جزیرہ ہے اور اطراف عالم سے جو بھی تجارتی بحری جہاز آئیں گے (۲۷)، یہیں لنگر انداز ہوں گے اور ادھر دیار ربیعہ، موصل، آذربائیجان اور آرمینیا وغیرہ سے جہازوں میں جو سامان تجارت آئے گا وہ دجلہ وفرات ہو کر چلا آئے گا اور دیار مصر، رقہ، شام، شامی بندرگاہوں، مصر اور شمالی افریقہ سے فرات ہو کر جہاز یہاں آئیں گے (۲۸) اور اس علاقہ کی خوش حالی وفارغ البالی میں اضافہ ہوگا۔

عراق کی موجودہ طبعی وجغرافی حالت: قدیم عرب جغرافیہ نویسوں کے مطابق عراق کی سرحد شمال میں انبار سے شروع ہو کر تکریت تک پہنچتی تھی (۲۹)، لیکن موجودہ عراق مشرق میں دشتِ شام سے جنوب میں عرب کے لق ودق صحرائی علاقوں اور میدانوں نیز خلیج ایران کے شمالی ساحل سے مشرق میں جبل حمیرین (Zagros) کی جنوبی شاخوں اور مغربی خوزستان سے اور شمال میں انبار سے تکریت تک کھنچے ہوئے خط سے محیط ہے (۳۰)، اخبار ورسائل اور موجودہ نقشے کے مطابق عراق کے اہم علاقوں کی سطح سمندر سے اونچائی حسب ذیل ہے:

سطح سمندر سے ۶۵۶ فٹ تک بلند میدانی علاقوں میں بصرہ، قوت العمارہ، العزیزیہ، بغداد، سامرا، ناصریہ، سماوا، کوفہ، نجف، کربلا، الفلوجاہ اور رمادی وغیرہ اور ۶۵۶ سے ۱۳۱۲ فٹ

تک مرتفع ختنا قوئین، کرکک، اربیل اور موصل وغیرہ ہیں اور سلیمانیہ ۱۳۱۲ فٹ سے زیادہ بلند علاقوں میں واقع ہے، ساحل فرات کے مشہور عراقی شہروں میں حدیثیہ، ہیت، رمادی، ہبانیہ، الفلوجاہ، المصاحب ہلہ، کوفہ، سماوا اور نامریہ وغیرہ ہیں۔

اس وقت دجلہ ترکی کے وسطی حصہ سے نکل کر جنوب مشرق میں بہتی ہوئی موصل سے اتر کر عراق میں داخل ہوجاتی ہے اور عراق کے وسطی مشرقی حصہ سے گزرتی ہے، القوہ کے بعد اس کا بہاؤ مشرق کی سمت ہوجاتا ہے اور بصرہ سے شمال میں فرات سے مل کر مشترکہ ندی شط العرب کی صورت اختیار کرلیتی ہے اور بصرہ سے ہوتی ہوئی ایران کی سرحد پر آکر خلیج فارس میں گرجاتی ہے، ۱۰۰۵ کلومیٹر دجلہ عراق میں ہے اور شط العرب ۹۰ کلومیٹر لمبی ہے، دجلہ کے کنارے نینوا، موصل، الفتح، تکریت، سمرا، بغداد، قوت العمارہ اور قرنہ وغیرہ مشہور ومعروف شہر آباد ہیں، شط العرب کے کنارے بصرہ سب سے بڑا شہر ہے۔

عراق میں آب پاشی کے لیے نہروں کا نظام: آب پاشی کے مقصد سے بنائی گئی نہروں کے بہتر نظام کے سبب عراق کی اکثریت آج بھی زراعت کے پیشہ سے وابستہ ہے، جی، لی اسٹرینج کے بیان کے مطابق عراق کے شہر بصرہ کی شہرت اس کی نہروں کی وجہ سے رہی ہے، اس نے چوتھی صدی ہجری کے مشہور جغرافیہ داں ابن حوقل کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ ان کی تعداد ایک لاکھ تھی، جن میں سے بیس ہزار نہریں اس قدر کشادہ تھیں کہ اس میں کشتی رانی کی جاسکتی تھی (۳۱)، ابن حوقل، ابن سراپیوں، قدامہ، مستوفی، ابن خرداذبہ وغیرہ نے عراق کی بے شمار نہروں کا تذکرہ بڑی شرح وبسط سے کیا ہے، ذیل میں بعض ان نہروں کا ذکر کیا جاتا ہے جو دجلہ وفرات کو باہم ملادیتی تھیں، فرات سے دجلہ کی طرف جو نہریں نکلتی تھیں ان میں سب سے بڑی اور پہلی نہر نہر عیسی تھی، اس کے کنارے شہر انبار آباد تھا، اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مضمون نگار نے اس کی گزرگاہ کے بارے میں شک ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آج کل کی نہر صقلاویہ ہی نہر عیسی کے نام سے عہد عباسی میں جانی جاتی تھی (۳۲)، ابن سراپیوں نے جو یعقوبی کا ہم عصر ہے بغداد کے بلدیاتی حالات بالخصوص نہروں کے متعلق بڑی تفصیل سے لکھا ہے، اس کے بیان کے مطابق یہ نہر عیسی بن موسی خلیفہ منصور کے بھتیجے کے نام سے موسوم ہے، اس نے اس نہر کو فرات سے بغداد

تک کشتیوں اور جہازوں کی آمد ورفت کے لیے وسیع کروایا تھا، یہ نہر فیروز سابور کے بہت سے دیہی علاقوں اور کھیتوں کو سیراب کرتی ہوئی مغربی بغداد کے ایک فرسخ یعنی تین میل کے فاصلہ پر واقع شہر محول تک پہنچتی تھی (۳۳) اور محول کے مقام پر اس سے متعدد شاخیں بغداد کی جانب سے نکلتی تھیں اور پھر قصر ابن ہبیرہ سے نیچے دریائے دجلہ میں مل جاتی تھی (۳۴)، ان میں ایک دوسری نہر جو دجلہ وفرات کو باہم ملاتی تھی نہر صرصر تھی، یہ فرات سے نکل کر مدائن سے ۱۲ میل شمال میں دجلہ سے مل جاتی تھی اور مغربی بغداد کے جنوب میں واقع شہر بادرویا سے ہوکر گزرتی تھی، ابن سراپیوں نے لکھا ہے کہ اس کے کنارے بے شمار رہٹ اور ڈھکلیاں کھیتوں کی آب یاری کے لیے لگی ہوئی تھیں اور یہاں سے کسی قدر شمال میں زریراں کے قریب میں یہ نہر دجلہ میں گرجاتی تھی اور ساسانیوں کے قصر ابیض کے قریب شہر صرصر آباد ومعمور تھا (۳۵)، صرصر کے متعلق یاقوت نے لکھا ہے کہ بغداد کے قریب نہر عیسی کے کنارے صرصر کے نام سے دو گاؤں بالائی صرصر اور نشیبی صرصر واقع ہیں، بعض اوقات ان کو نہر صرصر بھی کہتے ہیں، نشیبی صرصر اور بغداد کے درمیان کی دوری ۶ میل ہے (۳۶)، دجلہ وفرات کو ملانے والی تیسری نہر نہر الملک تھی، یہ بہت قدیم شاہی نہر تھی، یونانی اسے نہر ملکا کہتے تھے (۳۷)، یاقوت نے لکھا ہے کہ نہر عیسی کے بعد یہ وسیع نہر ۳۶۰ گاؤں کو سیراب کرتی تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کو سلیمان یا سکندر اعظم نے کھدوایا تھا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کو اقفور شاہ بن بلاس نے کھدوایا تھا جس کو اس کے قائم مقام اردشیر بابک نے قتل کردیا تھا، اردشیر نبطیوں کا آخری حکمراں تھا جس نے دو سو سال حکومت کی تھی (۳۸)، یہ نہر نہر صرصر کے سرے سے ۱۵ میل جنوب میں الفلوجہ سے شروع ہوتی تھی اور مداین سے ۱۲ میل جنوب میں دجلہ سے آکر مل جاتی تھی (۳۹) لیکن اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مضمون نگار کی تحقیق کے مطابق ابن سراپیوں (ص ۱۶) کے اس بیان کو لی، اسٹرینج نے غلط ٹھہراتے ہوئے لکھا ہے کہ نہر الملک کا الفلوجہ سے شروع ہونا درست نہیں کیوں کہ یہ جگہ نہر عیسی کے منبع سے ۳۰ میل دور ہے (۴۰)، دجلہ وفرات کے باہمی اتصال والی نہروں میں نہر کوثی ہے جو دریائے فرات سے نکل کر نہر الملک سے ۳ فرسخ (۹ میل) جنوب میں اور مدائن سے دس فرسخ (۳۰ میل) جنوب میں دجلہ سے مل جاتی ہے (۴۱)، ابن سراپیوں کے بیان کے مطابق کوثی نام کے علاقے

کونہر کوثی سیراب کرتی تھی جس کا پہلا ساسانی نام کسریٰ کے نام پر علاقہ اردشیر بابکان تھا (۴۲)، یاقوت نے نہر کوثی کی نسبت بہت سی روایتیں نقل کی ہیں، ایک روایت کے مطابق کوثی دو بستیوں پر مشتمل ہے، ایک کوثی الطریق اور ایک کوثی ربی اور یہ دونوں بستیاں بابل میں تھیں، ایک روایت یہ بھی ہے کہ نہر کوثی حضرت ابراہیمؑ کے دادا کے نام سے منسوب ہے اور کوثی ہی وہ مقام ہے جہاں نمرود نے حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا تھا (۴۳)، لی اسٹرینج نے ابن حوقل کی یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ کوثی ربی بابل کا بڑا شہر تھا اور اس کے قریب راکھ ٹیلے تھے جن کو نمرود کے آتش دان کا مقام سمجھا جاتا ہے (۴۴)، بعد کے جغرافیہ نویسوں نے نہر کوثی کا منبع نہر تکریت سے ذرا نیچے بتایا ہے (۴۵)، مذکورہ بالا نہروں کے متعلق تاریخی معلومات کے مطالعہ سے قدیم زمانے میں عراق کی سرسبزی وشادابی کے اسباب کا اندازہ مختصراً ہوگیا ہوگا، اب ممکن ہے نہروں کے اس نظام کی بہت زیادہ ضرورت باقی نہ رہ گئی ہو اور موجودہ سائنسی عہد میں جس طرح اور ملکوں میں ذرائع آب پاشی میں تبدیلی آئی ہے وہاں بھی آگئی ہو اور نہروں سے کھیتوں کے سیراب کرنے کا طریقہ اور اس کا رواج قریب الختم ہو اور اب ان کی جگہ ٹیوب ویل اور سرسی ایبل نے لے لی ہو۔

آدم ثانی حضرت نوحؑ اور ان کی مخاطب قوموں کا تمدن: حضرت آدمؑ سے حضرت نوحؑ تک کے زمانے کے حالات پردۂ خفا میں ہیں، تاہم اثری تحقیقات سے یہ ثابت ہے کہ عراق کا سب سے قدیم شہر بابل ہے، کتبات اور مورخین ومفسرین کے بیان کے مطابق قوم نوح موجودہ عراق میں واقع دجلہ وفرات کے درمیان موصل کے نواح میں آباد تھی (۴۶)، اس پورے علاقہ کا رقبہ ۴۰۰ میل لمبا اور ۱۰۰ میل چوڑا تھا (۴۷)، حضرت نوحؑ کی مخاطب قوموں میں سومری اور اکدی قوموں کا نام نمایاں ہے، قبل مسیح کے تیسرے ہزارے میں ان کی شان دار تاریخ تھی، انہوں نے بابل کو اپنا مرکز بنایا تھا، بابل کے اس عہد کے کتبات سے محققین نے نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہاں (بابل وعراق) میں پہلے (حضرت نوح کے زمانے میں) سومری اور اکادی (تورانی النسل) قوم آباد تھی، ڈاکٹر شرف محمد عالم (لفٹنٹ) کی تحقیق کے مطابق عہد قدیم میں دوآبہ دجلہ وفرات میں آباد سومری اور اکدی قوم میں ایک ہی خانوادے سے متعلق رکھتی تھی، ۳۱۰۰ ق م سے ۱۹۷۹ قبل مسیح تک سومری قوم دجلہ وفرات کے دونوں جانب اور اکدی قوم شمال مشرقی علاقہ میں آباد تھی

اور اور، اوردک، ارخ اور نیپور سومریوں اور سیپار، کیش اور بابل اکدی قوم کا شہر تھا۔ (۴۸)

عراق کے قدیم ترین باشندے سومری اور اکدی جو طوفان نوح سے قبل وہاں رہائش پذیر تھے اور جن کو قرآن نے قوم نوح کے نام سے مخاطب کیا ہے، تہذیب وثقافت اور اعلا انسانی تمدن کے اولین بانی قرار دیے جاسکتے ہیں، گرچہ اس عہد کی قدیم تمدنی اور علمی تاریخ گردش روزگار اور مرور ایام کے سبب پردۂ خفا میں ہے تاہم سطور ذیل میں قرآن مجید کے بیان کردہ اشاروں سے ان کے تمدن کا جو نقشہ سامنے آتا ہے اسے نقل کیا جاتا ہے، قرآن مجید نے قوم نوح سے متعلق جو تصریحات اور اس کی جانب جس قسم کے الفاظ منسوب کیے ہیں، ان سے معتبر اور مستند نتائج اخذ کرنا آسان ہوگیا ہے، ان آیتوں کی روشنی میں مولانا مناظر احسن گیلانی نے ان کی ذہنی، تمدنی، معاشرتی اور سماجی کیفیت یوں بیان کی ہے:

> "قوم نوح کے متعلق آج کوئی چاہے تو ان تاریخی نتیجوں کو پیدا کرسکتا ہے، مثلاً زراعت و باغ بانی ہی نہیں بلکہ آب پاشی کے عام ذرائع خصوصاً دریاؤں کو کاٹ کر نہروں کا نظام بھی قائم کرچکی تھی اور اونٹ، گائے بیل بھیڑ، بکریوں کی پرورش و پرداخت اور ان سے مناسب کام لینے کا عام رواج تھا اور ثیاب ودسر کے الفاظ سے جامہ بافی اور آہن گری جیسی صنعتوں کے چلن میں تو کسی قسم کے شبہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، کشتی سازی کا فن بھی عہد نوح تک ارتقائی منزلیں طے کرچکا تھا (۴۹) سورہ نوح میں وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ اور سورۂ قمر میں سفینہ نوح کے متعلق "ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ" کے الفاظ قوم نوح کی ہی جانب قرآن نے منسوب کیے ہیں"۔ (۵۰)

اسی کے ساتھ طبقاتی تقسیم اور اعلا و ادنی برادری کا احساس اس قدر بڑھ گیا تھا کہ حضرت نوح کے اعلان نبوت کے بعد اس سے انکار کی ایک خاص وجہ یہ بھی ان کی قوم کی طرف سے پیش کی گئی تھی کہ تمہارے پیرو تو ادنی درجہ کے لوگ ہیں، ایذادہی کی مشق اور احتجاج کے معاملے میں بھی قوم نوح موجودہ زمانے کے بالمقابل کم نہ تھی، سورۂ مومنون کی آیت ۲۴ و ۲۵ کے بالاستیعاب مطالعہ سے مترشح ہوتا ہے کہ حضرت نوح کے دعوائے نبوت کے انکار کی پانچ وجہیں

ان کی قوم کی طرف سے پیش کی گئی ہیں، اپنے انکار کی توجیہ میں انہوں نے حضرت نوحؑ کے جدید علمی ذریعہ کو اس لیے تسلیم نہیں کیا کہ وہ انہیں جیسے آدمی تھے، ان کے مطابق احساس وادراک کی جو قوتیں سب میں مشترک ہیں کوئی وجہ نہیں کہ نوح میں کوئی نئی قوت ادراک پیدا ہو، ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے یہ دعوا صرف ہم پر اپنی افضلیت وبرتری ثابت کرنے کے لیے کیا تھا، نیز اس کا یہ کہنا کہ میں اپنی قوم کی خرابیوں کی اصلاح کے لیے مبعوث ہوا ہوں، سراسر غلط اور بے بنیاد ہے کیوں کہ اس کام کے لیے ہماری طرف فرشتوں کو بھیجنا اللہ کے لیے زیادہ آسان تھا جو ہم سے ممتاز اور نمایاں خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں، جنہیں عوام اور خواص بآسانی مان لیتے، پھر ان کی قوم نے تاریخی شہادت یہ پیش کی کہ اس سے پہلے ہماری گزشتہ تاریخ میں اس طرح کے جدید علمی ذریعہ (وحی) اور دعوا کی کوئی شہادت نہیں ملتی اور آخر میں یہ کہا کہ اس شخص کا دماغی توازن برقرار نہیں ہے، اس لیے بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے، کچھ دنوں بعد ٹھیک ہو جائے گا۔

حضرت نوحؑ کی دعوت کے مخالفین کے اعتراضات اور واقعہ کے بعض پہلوؤں کے متعلق معلومات کا جو ذخیرہ قرآن نے محفوظ کر دیا ہے اس سے قوم نوح کی منطقی اور استدلالی قابلیت کا اندازہ بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے، نیز یہ قوم تہذیب وثقافت کے بام عروج پر پہنچنے کے ساتھ ساتھ فکری وذہنی بے اعتدالیوں کی شکار ہو چکی تھی، سومریوں کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ یہ قوم تین خداؤں، زمین، آسمان اور درہ عمیق کے پجاری تھے، جن اور شیاطین پر ان کو مکمل اعتقاد تھا، کاہنوں کا بڑا احترام کرتے تھے، مختلف علاقوں کے امرا کو پاتسی کے لقب سے ملقب کرتے تھے، جو جنگ وصلح میں فیصلے صادر کرتے اور ان کے فیصلہ یا رائے کے خلاف کوئی جا نہیں سکتا تھا، ان کی زبان بنی سام کی زبان سے الگ تھی، سومری خط میخی کے موجد ہیں، معاشرتی وملکی قوانین کی ترتیب کا آغاز اسی قوم نے کیا، اس کے علاوہ مختلف علوم اور صنعتیں اسی قوم نے ایجاد کیں (۵۱)، جن کی شہادت سومری عہد کے کتبات دے رہے ہیں، سطور ذیل میں قوم نوح کے کیفر کردار تک پہنچنے کے واقعات کا التقاط قرآن مجید کے بیانات سے کیا جائے گا، کیوں کہ اس سے معتبر و مستند کوئی ماخذ نہیں ہے۔

حضرت آدمؑ نے نسل انسانی کو جس صالح نظام زندگی کی ترغیب اور اس پر عمل کرنے کی

تاکید کی تھی بلاشبہ ان میں سب سے زیادہ بگاڑ حضرت نوحؑ کے دور میں آیا جس کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق حضرت نوحؑ کو مبعوث کیا، حضرت آدمؑ کے بعد حضرت نوحؑ پہلے صاحب شریعت نبی ہیں، تاریخی روایتوں کے مطابق حضرت نوحؑ کا اصل نام عبدالشکور یا عبدالغفار تھا اور کثرت گریہ وزاری کے سبب نوحؑ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ (۵۲)

قوم نوحؑ کی بداعمالیاں: قرآن مجید کے بیان کے مطابق حضرت نوحؑ نے اپنی قوم میں ساڑھے نو سو برس تک تبلیغ ودعوت کا کام کیا (عنکبوت ۲۹: ۱۴)، ابن کثیر کی روایت کے مطابق حضرت نوحؑ ۵۰ برس کی عمر میں منصب نبوت سے سرفراز ہوئے (۵۳)، اسی طرح حضرت نوحؑ اپنی قوم میں ایک ہزار برس تک رہے اور انہیں شرک وبت پرستی اور دوسری اخلاقی وسماجی برائیوں سے باز رہنے کی تاکید کرتے رہے، سطور ذیل میں قرآن مجید کی پیش کردہ ان کی بداعمالیوں کی فہرست اجمالاً پیش کی جاتی ہیں، تاکہ نسل انسانی کے پہلے دور کے اختتام اور خدائی غضب کے واضح اسباب معلوم ہوسکیں۔

ان کا پہلا جرم شرک یعنی خدا کی یکتائی میں ود، سواع، یعوق، یغوث اور نسر وغیرہ جیسے مادی ہیکلوں کو شریک کرنا تھا (نوح: ۲۳)، مفسرین نے ان بتوں کے بارے میں لکھا ہے کہ ود کی مورت توانا اور قوی مرد کی شکل کی تھی جس کو انسانی قوت وطاقت کا اصل مظہر سمجھتے تھے، سواع کی مورت ایک حسین عورت کی شکل میں بنا رکھی تھی اور یہ حسن وجمال کی دیوی تھی، یغوث کی مورت شیر کی شکل کی تھی جس کو حیوانی اور جسمانی قوت وشہ زوری کا مظہر قرار دیا تھا، یعوق گھوڑے کی شکل کی مورت تھی جس کو بھاگ دوڑ اور تیز روی کی علامت خیال کرتے تھے، نسر باز یا عقاب کی شکل کا یہ دیوتا تھا، اسے حدت نظر اور ظاہری وباطنی گناہوں کا مظہر خیال کرتے تھے اور خاص بات یہ ہے کہ ان بتوں سے انہیں عشق کی حد تک لگاؤ تھا جس کو چھوڑنا ان کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن تھا، دوسرا جرم قوم کا فسق وفجور میں مبتلا ہونا تھا (سورہ ذاریات: ۴۶)، مفسرین نے لکھا ہے کہ فاسق قرآن میں جہاں بھی استعمال ہوا ہے اس سے ایسی قوم یا ایسے شخص کو جس کے اندر انسانی، اخلاقی اور سماجی ہر قسم کی خرابیاں موجود ہوں مراد لیا گیا ہے، تیسرا جرم ۹۵۰ برس تک اپنے نبی کی تکذیب (سورہ قمر: ۹)، چوتھا جرم آل واولاد کی کثرت، حسن وصحت، شاداب زمینوں، دنیوی خوش حالیوں

پر فخر وغرور اور آباواجداد کی جاہلانہ رسموں پر ثابت قدمی واستقلال اور نخوت وتکبر (۲۱و۷)، پانچواں جرم ان کا ظلم وزیادتی کرنا (عنکبوت: ۱۴)، چھٹا دعوت وارشاد سے انتہائی نفرت کا اظہار بایں صورت کہ اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے منھ ڈھک لیے (سورہ نوح: ۷) حضرت نوحؑ پر اقتدار کے بھوکے ہونے کا الزام لگانا (سورہ مومنون: ۲۴-۲۵) اور انہیں سنگسار کرنے کی دھمکی دینا (شعرا: ۱۱۶)، اس کے علاوہ سورۂ ہود کی آیت نمبر ۲۷ سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان میں طبقاتی تقسیم اور ذات پات کی بیماری بھی لگ چکی تھی، مختصر یہ کہ مذکورہ بالا اخلاقی، سماجی، فکری، معاشرتی اور نظریاتی برائیوں اور متنوع بداعمالیوں میں مبتلا ہونے کی بنا پر قوم نوح (سومری اور اکدی قومیں) عذاب کی مستحق قرار پائی۔

مطالبۂ عذاب: طاقت وقوت اور کبر ونخوت کے زعم میں قوم نوحؑ کی بیباکی وبے خوفی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ خود ہی عذاب الٰہی کا مطالبہ کرنے لگی، چنانچہ سورہ نوح کی آیت کا یہ ٹکڑا "فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ" ان کے مطالبہ عذاب کا ثبوت ہے۔

اپنی قوم کی جانب سے اہانت آمیز کلمات، طعن وتشنیع، ذہنی ونفسیاتی ایذا رسانیوں کا مسلسل سامنا کرنے کے بعد حضرت نوحؑ نے دیکھا کہ ان میں قبولیت حق کی صلاحیت بالکل ہی باقی نہیں ہے اور پوری قوم دنیاوی آلائشوں میں ملوث ہے اور ان کی دعوت وتبلیغ پر ذرا بھی کان نہیں دھر رہی ہے تو دربار الٰہی میں اپنی قوم کی فہرست جرائم پیش کرتے ہوئے درخواست گزار ہوئے، اے میرے رب! انہوں نے میری ایک نہ سنی بلکہ ایسے روٴسا اور امیروں کے بہکاوے میں آگئے جن کے مال اور اولاد نے خود ان کو گھاٹے اور دھوکہ میں رکھا ہے (نوح ۷۱: ۲۱و۲۲)، اس لیے اے میرے رب ان کافروں میں سے زمین پر کوئی بسنے والا نہ چھوڑ، اگر تو نے ان کو چھوڑ دیا تو یہ تیرے فرماں برداروں کو گم راہ کردیں گے اور ان کی نسل سے جو پیدا ہوگا بدکار اور سخت کافر ہوگا (نوح ۷۱: ۲۶و۲۷)، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کشتی بنانے کا حکم دیا۔

کشتی سازی کا حکم: قرآن مجید کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اپنی نگرانی میں کشتی بنانے کا حکم دیا، "ہماری نگرانی میں ایک کشتی بنانی شروع کردو اور ہاں ظالموں کے حق میں مجھ سے سفارش نہ کرنا، یہ ظالم تہ آب ہونے والے ہیں (ہود ۱۱: ۳۷و۳۸)، ابن قتیبہ نے توریت

کے حوالے سے لکھا ہے کہ "اوحی اللہ الیہ ان اصنع الفلک ولیکن طولها ثلثماة ذراع و عرضها خمسین ذراعا وارتفاعها ثلاثین ذراعا ولکن بابها فی عرضها" (۵۴)، اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو وحی کی کہ ایک کشتی بنائیں جس کی لمبائی تین سو ہاتھ، چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ اور اس کا دروازہ اس کی چوڑائی میں ہو، مولانا عبدالماجد دریابادی کی صراحت کے مطابق کشتی کی تیاری میں دو برس کا عرصہ لگا۔ (۵۵)

پہلے گزر چکا ہے کہ عہد نوح میں کشتی سازی کا فن اپنے ارتقائی مراحل طے کرچکا تھا لیکن بعض مفسرین نے اس کے برعکس لکھا ہے کہ یہ فن پہلی مرتبہ حضرت نوح کو ودیعت کیا گیا تھا اور ان پر اس فن کی باریکیاں الہام ہوئی تھیں (۵۶)، صاحب روح المعانی نے "وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا" کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت عائشہؓ سے مروی ایک حدیث نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا حضرت نوحؑ نے اپنی قوم میں ساڑھے نو سو برس تک تبلیغ کی یہاں تک کہ اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک درخت لگایا سواسے جتنا بڑا ہونا تھا بڑا ہوا، پھر اس کو کاٹ کر کشتی بنانا شروع کیا تو ان کی قوم نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو، حضرت نوحؑ نے کہا کشتی بنا رہا ہوں، انہوں نے پھر استہزا وتمسخر کے لہجہ میں کہا کہ کشتی خشکی پر کیسے چلے گی، حضرت نوحؑ نے جواب دیا کہ عن قریب تم کو اس کا علم ہوجائے گا، پھر لکھتے ہیں کہ اکثر علما اس پر متفق ہیں کہ ان کی قوم نے اس سے پہلے کشتی نہیں دیکھی تھی (۵۷)، صاحب روح المعانی کا خیال ہے کہ حضرت نوحؑ کی کشتی سازی کا مذاق انہوں نے اس لیے اڑایا تھا کہ وہ بہ ذات خود کشتی یا اس کے استعمال سے ناواقف تھے، دلیل میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اللہ نے حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم دیا تو حضرت نوحؑ نے کہا "اے اللہ کشتی کیا ہے، تو اللہ نے فرمایا لکڑی سے بنایا گیا ایسا گھر جو پانی پر تیرے گا، تو پھر حضرت نوحؑ نے پوچھا، اے بار الٰہا، پانی کہاں ہے؟ فرمایا میں ہر چیز پر قادر ہوں" (۵۸)، (غالباً طوفان نوح کی طرف اشارہ ہے)۔

حضرت عائشہؓ کی روایت اور حضرت ابن عباسؓ کے قول کی روشنی میں یہ بات پورے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو پہلی مرتبہ اس فن سے واقف کیا، اس طرح یہ فن کشتی سازی الہامی تھا، جمہور علمائے تفسیر کا بھی یہی خیال ہے۔

بعض روایتوں کے مطابق سفینہ نوحؑ میں ساکھو کی لکڑی، بعض میں شمشاد کی اور بعض میں صنوبر کی لکڑی استعمال ہوئی تھی (۵۹)، کشتی کے اندرونی و بیرونی دونوں حصوں پر تارکول کا تیل مل دیا گیا تھا، اس کا اگلا حصہ بیچ سے پتلا تھا جو پانی کا سینہ چیرتا تھا۔(۶۰)

کشتی کا طول و عرض اور اس کی کیفیت: مفسرین اور شارحین تورات نے لکھا ہے کہ قرآن میں لفظ "فلک" کے استعمال سے واضح مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہ کشتی چھوٹی موٹی نہیں تھی بلکہ اچھا خاصا سہ منزلہ جہاز تھا، اوپر گزر چکا ہے کہ کشتی کو بنانے میں دو برس لگا، شارحین تورات کے بیان کے مطابق کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ، چوڑائی پچاس ہاتھ، اونچائی تیس تھی (پیدائش ۶: ۱۵)، حضرت قتادہ کا بھی یہی قول ہے، اس کے برعکس ابن عباس اور حسن بصری کے اقوال بھی ابن کثیر نے نقل کیے ہیں (۶۱)، محققین اثریات نے سفینہ نوح کی لمبائی ۳۲۵ فٹ، چوڑائی ½۸۷ فٹ، اونچائی ½۵۲ فٹ متعین کی ہے (۶۲)، مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے کہ یہ سہ منزلہ جہاز ۴۵۰ فٹ لمبا، ۷۵ فٹ چوڑا اور ۴۵ فٹ اونچا تھا (۶۳)، تاریخوں اور روایتوں میں آتا ہے کہ کشتی میں تین طبق تھے اور ہر طبق دس ہاتھ کا تھا سب سے نچلے حصے میں حشرات الارض، وسط میں نوح کے ماننے والے اور سب سے اوپر پرندے تھے (۶۴)، دی قرآن انگلش ٹرانسلیشن میں کشتی نوح کے متعلق لکھا ہے:

The Lenght of ark shall be three hundred cubits, the breadth of it fifty cubits and the height of it thirty cubits.

یعنی کشتی نوح تین سو ہاتھ لمبی، پچاس ہاتھ چوڑی اور ۳۰ ہاتھ اونچی تھی۔(۶۵)

طوفان کا زمانہ اور اس کی نوعیت: ماہرین توریت کے تخمینہ کے مطابق حضرت نوحؑ کا زمانہ (۳۸۰۱-۲۸۵۰) قبل مسیح سمجھا گیا ہے (۶۶)، توریت میں درج ہے کہ حضرت نوحؑ چھ سو برس کے تھے تو اللہ نے دوسرے مہینے کی ۱۷ ویں تاریخ کو زمین پر طوفان بھیجا (تکوین ۷: ۶-۱۰)، طوفان کے بعد حضرت نوحؑ ۳۵۰ برس زندہ رہے (تکوین ۹: ۲۸)، بایں طور ۳۲۰۱ قبل مسیح میں نوحؑ ۶۰۰ برس کے تھے اور یہی طوفان کی آمد کا زمانہ یعنی ۳۲۰۱ ق م متعین ہوتا ہے۔

طوفان نوح کی ابتدا اور اس کے ظہور کی تشریح و توضیح میں مفسرین و شارحین نے بڑی

لمبی بحثیں کی ہیں مگر قرآن مجید کے صریح الفاظ کی روشنی میں جو باتیں بہ آسانی سمجھ میں آجاتی ہیں، اس کا تذکرہ یہاں زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے، ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اس طوفان کی ابتدا کے متعلق قرآن مجید کی بعض آیتوں مثلاً سورۂ عنکبوت: ۱۴، قمر: ۱۱-۱۲، ھود: ۴۲، یونس: ۲۲، شوریٰ: ۳۲-۳۳، روم: ۴۶، اور کلام عرب کی روشنی میں جو تحقیق پیش کی وہ خاصے کی چیز ہے اور زیادہ سائنٹفک معلوم ہوتی ہے، اس کی تلخیص ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

مولانا فراہی کی تحقیق کے مطابق قوم نوحؑ کی تباہی میں اور قوموں کی طرح اصل دخل ہوا کے تصرف کو رہا ہے، چنانچہ سورہ عنکبوت میں لفظ "طوفان" کے استعمال سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، طوفان کے لغوی معنی گردش کرنے اور چکر لگانے کے ہیں اور کلام عرب کے عام مفہوم میں طوفان تیز و تند ہوا کو کہتے ہیں اور طوفان کی خاصیت یہ ہے کہ اس سے شدت کی بارش ہوتی ہے اور سمندر کا پانی جوش میں آجاتا ہے، چنانچہ تورات اور قرآن میں اس طوفان سے متعلق جو صراحتیں وارد ہیں، ان سے صاف طور پر سمجھا جاسکتا ہے کہ قوم نوح پر تند اور چکر دار ہوا کا طوفان آیا جس سے سخت بارش ہوئی، پاس کے سمندروں کا پانی ابل پڑا اور ہر طرف موجیں اچھلنے لگیں اور اس طوفان میں سفینہ نوح سطح آب پر تیرنے لگا۔(۶۷)

قرآن مجید نے طوفان نوح کی کیفیت کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

پھر ہم نے موسلا دھار بارش سے آسمان کے دہانے کھول دیے اور زمین سے چشمے بہا دیے، پھر تمام پانی ایک ہی کام کے لیے جو مقدر ہو چکا تھا جمع ہوگیا اور پھر ہم نے اس کو تختوں اور میخوں والی (کشتی) پر بار کرلیا۔(القمر ۱۱: ۱۲)

سورۂ ہود کی آیت ۴۱ میں ہے کہ "وہ کشتی ان کو پہاڑوں جیسی لہروں پر لے جارہی تھی، قرآن کے بیان کے مطابق جب کشتی تیار ہوگئی تو ہمارے ایماء سے تنور ابلنے لگا تو اللہ نے حضرت نوح کو حکم دیا کہ ہر ایک جنس سے ایک جوڑا دو عدد اس میں سوار کرلو۔(ہود: ۴۲)

شارحین توریت کا بیان ہے کہ اللہ نے نوح کو وحی کی کہ جب کشتی تیار ہوجائے تو اس میں تم، تمہاری بیوی، تمہارے بیٹے اور ان کی بیویاں سوار ہوجائیں (۶۸)، ہر گوشت دار حلال جانور کے نر و مادہ کے دو دو جوڑے بھی اس میں رکھ لو کیوں کہ میں زمین پر لگاتار چالیس شب و روز مینہ

برساؤں گا اور زمین پر جو کچھ میں نے پیدا کیا ہے اس کو تلف کردوں گا، آب نوس کی لکڑی کا ایک تابوت بنا کر اس میں حضرت آدمؑ کی لاش بھی رکھ لینا اور اپنے ساتھ ایک سال کا سامان خورد و نوش بھی رکھ لینا، چنانچہ نوحؑ نے ایسا ہی کیا۔ (۶۹)

ایک غلط فہمی کا ازالہ: مذکورہ بالا اسرائیلی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ کشتی میں حضرت نوحؑ اور ان کے اہل خانہ کے علاوہ کوئی اور سوار نہیں ہوا تھا، چوں کہ اس طوفان کی زد سے کسی دوسرے خاندان کی نسل محفوظ نہیں رہی، اس لیے طوفان نوح کے بعد کی تمام انسانی نسلوں کا شجرۂ نسب حضرت نوحؑ کے تینوں بیٹوں تک ہی پہنچتا ہے لیکن خود قرآن میں متعدد مقامات پر ایسی صراحتیں موجود ہیں جن سے اس نظریہ کی تردید ہوتی ہے، سورۂ ہود کی آیت ۴۲ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ وَمَا آمَنَ مَعَهٗ اِلَّا قَلِيْلٌ کے علاوہ سورۂ بنی اسرائیل: ۳ اور مریم: ۵۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ خاندان نوحؑ کے علاوہ ان کی قوم کے متعدد افراد بھی کشتی میں سوار تھے۔

کشتی کے سواروں کی تعداد: سفینۂ نوح میں سوار مرد و عورت کی صحیح تعداد کا علم تو صرف اللہ کو ہے، البتہ اس سلسلہ میں مفسرین و مورخین کے بیانات کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، حضرت ابن عباسؓ نے ۸۰، کعب الاحبار نے ۷۲ بتائی ہے، بعض روایتوں میں دس اور سات کی بھی تعداد مذکور ہے، البتہ ابن عباس کا قول قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ طوفان تھمنے کے بعد جب یہ لوگ کشتی سے باہر آئے تو ایک گاؤں آباد کیا جس کا نام "ثمانین" رکھا، اس لیے کہ حضرت نوحؑ کے ساتھیوں میں ہر شخص کے لیے ایک گھر مخصوص تھا، آگے اس نے لکھا ہے کہ وہب بن منبہ کے زمانہ میں اس گاؤں کا نام "سوق ثمانین" تھا۔ (۷۰)

حضرت قتادہ کے قول کے مطابق حضرت نوحؑ ۱۰ رجب کو اپنے متبعین و متعلقین کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے اور ۱۵۰ دن تک اس میں رہے (۷۱) اور ۱۰ محرم کو اس سے باہر آئے (۷۲)، ابن عباس کا قول بھی کشتی میں حضرت نوح کے ۱۵۰ دن تک رہنے کی تائید کرتا ہے۔ (۷۳)

اصول درایت کی روشنی میں اگر مذکورہ بالا روایتوں کو پرکھا جائے تو ان میں سقم ہے، کیونکہ ۱۰ رجب سے ۱۰ محرم تک اگر تمام مہینے تیس دن کے مان لیے جائیں تو کل ۲۱۰ دن ہوتے ہیں،

جب کہ روایت میں ہے کہ حضرت نوح ۱۵۰ دن کشتی میں رہے۔

طوفان نوحؑ کا رقبہ: مفسرین کی ایک جماعت نے طوفان نوحؑ کے پانی کا کل رقبہ چالیس ہزار کلومیٹر (۴۰۰×۱۰۰) بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ آبی طوفان دجلہ و فرات کے درمیانی حصوں میں آیا تھا (۷۴)، مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ زمین کے سب سے اونچے پہاڑ کی چوٹی سے ۱۵ ہاتھ پانی اونچائی پر پہنچ گیا تھا اور تا حد نگاہ پانی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تھا (۷۵)، صاحب روح المعانی کے بیان کے مطابق پانی پہاڑ کی چوٹی سے ۱۵ ہاتھ اوپر کو پہنچ گیا تھا۔ (۷۶)

طوفان کی عالم گیری اور کشتی میں تمام جانوروں کا سوار ہونا: طوفان نوحؑ کی عالم گیری اور کشتی میں تمام جانوروں کے سوار ہونے کا مسئلہ مورخین و مفسرین کے مابین ہمیشہ سے مختلف فیہ رہا ہے، اسرائیلی روایات کے مطابق یہ طوفان عالم گیر تھا اور کشتی نوح میں جانوروں کے تمام اقسام سوار کر لیے گئے تھا، تاکہ ان کی نسلیں دنیا سے ناپید نہ ہوں لیکن خود قرآن مجید کے بیانات سے اس نظریہ کی اطمینان بخش تائید نہیں ہوتی، کیوں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ بیان ہوئی ہے کہ "تمہارا رب بستیوں کو اس وقت تک ہلاک نہیں کرتا جب تک کہ ان میں اپنا پیغمبر نہ بھیج دے، جو ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائیں اور جب تک ان بستیوں کے رہنے والے ظالم نہ ہوں، ہم ان کو غارت نہیں کرتے"۔ (قصص: ۵۹)

مذکورہ آیت سے بالکل صاف ہے کہ طوفان نوحؑ عالم گیر نہیں تھا کہ جس قوم میں کوئی نبی مبعوث نہ ہوا ہو، اس کو اللہ تعالیٰ ہلاک نہیں کرتا، سو اس طوفان کی زد میں قوم نوحؑ تھی جو وادی دجلہ و فرات تک محدود تھی، آثار قدیمہ کے محققین بھی اس طوفان کے عالم گیر ہونے کے قائل نہیں ہیں۔

رہا یہ مسئلہ کہ کشتی میں دنیا کے تمام جان داروں کے جوڑے حضرت نوحؑ نے بار کر لیے تھے جیسا کہ عہد نامۂ عتیق کے علاوہ اور قدیم عربی مراجع میں بھی اس کی تصریحات ملتی ہیں مگر اس طرح کی روایتیں درایتاً ناقابل قبول ہیں، کیوں کہ اتنی بڑی تعداد میں مختلف مقامات سے ان جانوروں کا اکٹھا کرنا اور پھر ان کی خوراک وغیرہ کا انتظام کرنا عقلاً بالکل مستبعد معلوم ہوتا ہے، اس بنا پر اگر اس طوفان کی عدم عالم گیر ہونے کا خیال تسلیم کر لیا جائے تو مسئلہ بہت حد تک صاف ہو جاتا ہے کہ کشتی نوح میں وہی جانور اکٹھے کیے گئے ہوں گے جن کی گرفت آسان اور جو اس

علاقہ کے افراد کے لیے مفید اور کارآمد رہے ہوں اور طوفان کے بعد بھی نئی آبادکاری میں جن کی ضرورت پڑنے والی تھی، مثلاً گائے، بھیڑ، بکریاں اور اونٹ وغیرہ۔

توریت کے بیان کے مطابق مسلسل چالیس روز تک بارش ہوتی رہی اور تقریباً سات ماہ تک کشتی سطح آب پر تیرتی رہی، پھر اللہ تعالیٰ نے زمین پر ہوا بھیجی (۷۷)، قرآن مجید کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ نے زمین سے کہا کہ ''اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! تھم جا اور پانی خشک کردیا گیا اور کام تمام ہوا اور کشتی کوہ جودی پر جا ٹھہری اور کہا گیا کہ ظالموں کے لیے (اللہ تعالیٰ کی رحمت سے) دوری ہے۔

جودی کہاں ہے؟: کوہ جودی کردستان کے علاقہ میں جزیرہ ابن عمر کے شمالی جانب واقع ہے، عہد نامہ عتیق کی روایت کے مطابق کشتی جبال اراراط پر رکی (۷۸)، اراراط آرمینیا کے ایک پہاڑی سلسلہ کا نام ہے جو آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک چلا جاتا ہے، جبل جودی اسی سلسلہ کا ایک پہاڑ ہے جو عہد اسلام اور موجودہ زمانے میں بھی جودی کے نام سے مشہور ہے، صاحب تفہیم القرآن نے لکھا ہے کہ تاریخوں میں کشتی نوح کے ٹھہرنے کی جگہ جبل جودی بتائی گئی ہے اور قرآن مجید نے اس کو جودی ہی کے نام سے یاد کیا ہے، ان کی تحقیق کے مطابق ڈھائی سو قبل مسیح بابل کے مذہبی پیشوا بیرائس (Berasus) نے پرانی کلدانی روایتوں کی بنا پر کشتی کے ٹھہرنے کا مقام جودی بتایا ہے، نیز ارسطو کا شاگرد ابیوڈلوس نے بھی اپنی تاریخ میں اس کی تصدیق کی ہے اور لکھا ہے کہ عراق کے بہت سے لوگوں کے پاس اس کشتی کے ٹکڑے محفوظ ہیں جو ان کے لیے بیماریوں میں شفا کا کام دیتے ہیں۔ (۷۹)

صاحب المنجد فی اللغۃ والاعلام نے لکھا ہے کہ جودی جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرق میں تقریباً ۴۰ کلومیٹر کی دوری پر خطہ بھوتان میں ۴ ہزار میٹر لمبے پہاڑی سلسلہ کا ایک پہاڑ ہے، روایت ہے کہ طوفان کے بعد کشتی نوح اسی پہاڑ پر ٹھہری تھی۔ (۸۰)

حضرت نوحؑ کی دعوت کے منکرین ومکذبین کے لیے یہ طوفان سزا کے طور پر آیا تھا، ماہرین اثریات کو سرزمین عراق میں دجلہ وفرات کے علاقے میں ایک مہیب وعبرت ناک طوفان کے باقیات ملتے رہتے ہیں، یہ نظریہ بھی بہت حد تک درست معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت

نسل انسانی کی تمام تر آبادی اسی علاقے میں بود و باش رکھتی تھی اور ترقی کے بام عروج پر فائز تھی، پتوں سے ستر پوشی کا رواج ختم ہو چکا تھا، کپڑے پہنے جاتے تھے، عبادت کے لیے گھر تعمیر ہونے لگے تھے، اونچ نیچ کی تفریق بھی تھی، صنعت وحرفت، امارت وسیادت غرض انسانی تمدن کی اعلا منزلیں قوم نوح طے کرچکی تھی لیکن دنیا طلبی اور بعض اخلاقی راہیوں میں ملوث ہونے کے سبب مالک حقیقی کو بھول چکی تھی اور حضرت نوحؑ کی مسلسل تبلیغ ودعوت کا اس پر کوئی اثر نہیں ہورہا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بغاوت وسرکشی کی پاداش میں صفحۂ ہستی سے انہیں مٹاڈالا اور حضرت نوحؑ، ان کی اولاد اور مومنین کی ایک مخصوص تعداد کو ہی نوع انسانی کی دوبارہ آبادی کے لیے طوفان کی زد سے محفوظ رکھا اور ایک پورے دور کے خاتمے کے بعد ان ہی سے نسل انسانی کو اس علاقے میں فروغ ہوا۔ (باقی)

حوالہ جات

(۱) المنجد فی اللغۃ والاعلام، ص ۴۵۸، ورلڈ ریفرنس اٹلس ص ۲۸۴، مطبوعہ ڈارلنگ کنڈرس لی لمیٹڈ ۱۹۹۸ء (۲) ورلڈ ریفرنس اٹلس ص ۲۸۴ (۳) قسمات العالم الاسلامی المعاصر ص ۲۲۲، مطبوعہ دار الفتح ۱۹۷۴ء لندن (۴) ورلڈ ریفرنس اٹلس ص ۲۸۵ (۵) توریت، تکوین ۱۴-۱۰ (۶) جغرافیہ خلافت مشرقی، جی لی اسٹرنج (اردو ترجمہ) ص ۳۲، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد ۱۹۳۰ء (۷) حمورابی اور بابلی تہذیب وتمدن ص ۶۷، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۱۹۹۲ (۸) ایران عہد قدیم کی سیاسی، ثقافتی ولسانی تاریخ ص ۴۵، مطبوعہ لیتھو پریس پٹنہ ۱۹۸۱ء (۹) معجم البلدان یاقوت حموی، ج ۵ ص ۱۶۹، مطبعۃ السعادہ مصر ۱۹۰۶ء (۱۰) کتاب المسالک والممالک، ص ۵، مطبع بریل لیڈن ۱۳۰۶ھ (۱۱) کتاب الاعلاق النفیسہ ص ۱۰۴، مطبعہ بریل لیڈن ۱۸۹۲ء، (۱۲) جغرافیہ خلافت مشرقی ص ۳۲ (۱۳) ایضاً، ص ۳۳ (۱۴) کتاب الوزراء لہلال الصابی ص ۶۸، مطبوعہ لیڈن ۱۹۰۴ء (۱۵) بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۳ ص ۲۷ (۱۶) معجم البلدان، ج ۳ ص ۱۳۳ (۱۷) جغرافیہ خلافت مشرقی باب دوم ص ۳۲ (۱۸) لسان العرب، ج ۲، ص ۷۵۲ (۱۹) میٹریکولیشن جیاگرافی ص ۲۰۵، ایجوکیشنل پبلی شرز لاہور ۱۹۴۲ء (۲۰) حمورابی اور بابلی تہذیب وتمدن ص ۶۸ (۲۱) المنجد فی اللغۃ والاعلام، ص ۵۲۱ (۲۲) جغرافیہ خلافت مشرقی باب دوم ص ۳۴ و ۳۵ (۲۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۳ ص ۲۹ (۲۴) جغرافیہ خلافت مشرقی باب دوم ص ۳۶ (۲۵) فتوح البلدان ص ۳۰۰، طبع اول مطبعۃ الموسوعات مصر

(۲۶) جغرافیہ خلافت مشرقی باب دوم ص ۳۷ (۲۷) کتاب البلدان یعقوبی ص ۲۳۷ مطبوعہ بریل لیڈن ۱۸۹۲ (۲۸) جغرافیہ خلافت مشرقی ص ۳۳ (۲۹) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۳ ص ۲۸ (۳۰) جغرافیہ خلافت مشرقی باب سوم ص ۶۱ (۳۱) ج ۱۳، ص ۳۰ (۳۲) ابن سراپیون ص ۱۴ بحوالہ جغرافیہ خلافت مشرقی باب چہارم ص ۸۶ (۳۳) اردو دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۱۳ ص ۳۱ (۳۴) ابن سراپیون ص ۱۴ بحوالہ جغرافیہ خلافت مشرقی ص ۸۷۶ (۳۵) معجم البلدان ج ۵ ص ۳۵۵ (۳۶) جغرافیہ خلافت مشرقی باب چہارم ص ۸۸ (۳۷) معجم البلدان ج ۸ ص ۳۴۶ (۳۸) جغرافیہ خلافت مشرقی باب چہارم ص ۸۸ (۳۹) ج ۱۳، ص ۳۲ (۴۰) جغرافیہ خلافت مشرقی حوالہ بالا (۴۱) ص ۱۵ بحوالہ جغرافیہ خلافت مشرقی باب حوالہ مذکور (۴۲) معجم البلدان ج ۷، ص ۲۹۱ (۴۳) بحوالہ جغرافیہ خلافت مشرقی ص ۸۹ (۴۴) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۱۳، ص ۳۲ (۴۵) تاریخ ارض القرآن ص ۸۸ (طبع جدید) وتمدن عرب، موسیو لیبان ص ۴۷ (۴۶) محققین عالم الالسنہ نے سریانی زبان کو صرف حضرت ابراہیم کی زبان تسلیم کیا ہے، طبقات الامم ص ۶، مطبعۃ السعادہ مصر (۴۷) ایران عہد قدیم کی سیاسی ثقافتی ولسانی تاریخ، ص ۴۵ (۴۸) معارف "سلیمان نمبر" ص ۲۲۲ و ۲۳۳، مئی ۱۹۵۵ء (۴۹) ایضاً (۵۰) ایران عہد قدیم الخ، ص ۴۶ (۵۱) تاج العروس ج ۲ ص ۲۴۴، فصل النون من باب الحاء (۵۲) البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۰۱ (۵۳) المعارف لابن قتیبہ دینوری، ص ۱۱، مطبعۃ الاسلامیہ مصر ۱۹۳۴ء (۵۴) تفسیر القرآن ص ۲۳۹، تاج کمپنی کراچی (۵۵) معارف القرآن ج ۴، ص ۶۲۰ و ۶۲۱ (۵۶) روح المعانی جز ۱۲ ص ۳۶ (۵۷) ایضاً ص ۴۴ (۵۸) ایضاً ج ۱۲ ص ۴۵ (۵۹) ابن کثیر ج ۱ ص ۱۱۰ (۶۰) ایضاً (۶۱) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲۲ ص ۷۷۴ (۶۲) تفسیر ماجدی ج ۲ ص ۵۴۱، نامی پریس لکھنؤ (۶۳) ابن کثیر ج ۱ ص ۱۱۰ (۶۴) ص ۲۱۵، جارج شیل فریڈرک لندن (۶۵) اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲۲ ص ۷۴۳ (۶۶) تفسیر نظام القرآن ص ۳۲-۳۵، دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر اعظم گڈھ (۶۷) اس میں حضرت نوح کے متعلقین اہل خانہ کے علاوہ دوسرے اہل ایمان کا تذکرہ نہیں ہے (۶۸) تکوین ۶، ۷: ۱۸ و ۷، ۹: ۱۹ و کتاب المعارف لابن قتیبہ ص ۱۱ (۶۹) المعارف لابن قتیبہ ص ۱۲ و روح المعانی ج ۱۲ ص ۶۵ و ۶۶ (۷۰) تفسیر بیضاوی ج ۱ ص ۳۷۶، مطبوعہ نول کشور (۷۱) ابن کثیر ج ۱ ص ۱۱۶ (۷۲) ایضاً (۷۳) بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ ج ۲۲ ص ۴۷۸ (۷۴) البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۱۲ و ۱۱۳ (۷۵) ج ۱۲ ص ۵۲ (۷۶) تکوین ۷: ۱۱ و ۱۲ و کتاب المعارف لابن قتیبہ ص ۱۱ (۷۷) تکوین ۸: ۵ (۷۸) تفہیم القرآن ج ۲ ص ۳۴۱ (۷۹) ص ۲۲۱ (حرف جیم)۔

غالب کے فارسی قطعات کی تاریخی اہمیت

از:- جناب محمد امین عامر صاحب ☆

مرزا اسد اللہ خاں غالب (۱۷۹۷-۱۸۶۹ء) فارسی زبان کے بڑے شاعر تھے، بعض لوگوں کے خیال میں ہندوستان میں ان پر فارسی شاعری کا خاتمہ ہوگیا، زیر نظر مضمون میں غالب کے فارسی کلام پر تبصرہ وتنقید مقصود نہیں بلکہ صرف ان کے فارسی قطعات کے ذخائر سے چند منتخب قطعات پر ایک غائرانہ نظر ڈال کر اس کی تاریخی اہمیت وافادیت بتانے کی کوشش کی گئی ہے اور بالاختصار توضیحی نوٹ بھی قلم بند کردیے گئے ہیں۔

سب سے پہلے زیر نظر قطعہ ملاحظہ ہو جس میں غالب نے پورے وثوق کے ساتھ حیات فانی کے تصور کو پیش کرتے ہوئے اس حقیقت کا ادراک کیا ہے کہ زندگی چند روزہ ہے، اگر نظیری اور طالب اور دیگر ہستیاں اس دنیا میں ہمیشہ نہ رہیں تو غالب کیا ہمیشہ رہنے کے لیے یہاں آیا ہے، اخیر شعر میں کس قدر قوت استدلال ہے، اس کا اندازہ ایک مرد مومن ہی کرسکتا ہے:

کیستم من کہ جاوداں باشم — چوں نظیری نماند و طالب مُرد
ور بگویند در کدامین سال — مُرد غالب؟ بگو کہ "غالب مُرد"

ترجمہ: (میں کون ہوں کہ ہمیشہ رہوں گا جب نظیری اور طالب نہ رہے، پوچھتے ہیں کہ غالب کب مرا؟ کہہ دو وہ بھی مرگیا)

یہ قطعہ مرزا غالب نے قاضی عبدالجمیل جنون بریلوی کے نام ایک خط میں درج کیا تھا جو پنج شنبہ ۸ر ستمبر ۱۸۵۹ء کو تحریر کیا گیا تھا، بریلوی صاحب نے مرزا کے نام اپنے خط میں نادانستگی میں یہ مصرعہ "کیستم من کہ تا ابد بزیم" (میں کون ہوں کہ ہمیشہ زندہ رہوں)، ان سے منسوب

☆ ۱۰۱- پیل خانہ سکنڈ لین، ہوڑہ نمبر-۱۔

کر دیا تھا، اس لیے مرزا نے جواباً بریلوی صاحب کو یہ لکھا "لاحول ولاقوۃ! یہ مصرعہ میرا نہیں" تا ابد بزیم" یہ فارسی لالہ قتیل کی ہے، میرا قطعہ یہ ہے "کیستم من کہ جاوداں باشم"۔ (۱)

قاضی عبدالجمیل جنونؔ: یہ غالب کے شاگرد اور بریلی کے رئیس اعظم تھے، ان کے آباء و اجداد مغلیہ سلطنت کے عروج کے زمانے میں مصر سے دہلی آئے، بادشاہ وقت نے ان کی بہت قدر و منزلت کی اور وہ ہمیشہ مناصب جلیلہ پر ممتاز رہے، ان کے والد کا نام قاضی عبدالجلیل (م ۳؍ دسمبر ۱۸۷۰ء) تھا، ان کی پیدائش ۱۲۵۱ھ/ ۱۸۳۵ء کو ہوئی تھی، وہ محلہ مولوی ٹولہ شہر بدایوں کے خانوادۂ عثمانی کے چشم و چراغ تھے اور عہد انگریزی میں بیلپور ضلع پیلی بھیت کے محکمۂ منصفی میں ملازم تھے، اس کے علاوہ وہ صدر الصدور کے عہدے پر بھی فائز ہوئے جس پر غالب نے انہیں ہدیہ تبریک سے نوازا، بعد ازاں برٹش سرکار نے انہیں بریلی کا قاضی اور آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا، وہ میونسپل بورڈ بریلی کے چیرمین بھی رہے اور ہمیشہ رفاہ عام کے کاموں میں سرگرم دکھے گئے، برٹش گورنمنٹ نے انہیں ۱۵؍ جون ۱۸۹۸ء کو خان بہادر کا خطاب عطا کیا، یہ اپنے استاد مرزا غالب سے بڑی عقیدت و محبت رکھتے تھے، ان کی وفات ۲۰؍ مئی ۱۹۰۰ء کو ہوئی اور ان کی تدفین ان کے آبائی قبرستان بنی پور بریلی میں عمل میں آئی۔ (۲)

نظیریؔ: ایران کے اس معروف شاعر کا نام محمد حسین اور تخلص نظیری تھا، یہ نیشاپور کا باشندہ تھا اور خراسان و کاشان میں اس کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی، وہ عہد اکبری میں ہندوستان آیا اور آگرہ میں عبدالرحیم خان خاناں سے اس کی ملاقات ہوئی جس کے توسط سے دربار اکبری تک اس کی رسائی ہوگئی لیکن اس کے بہت سے حاسد پیدا ہوگئے تھے جو اس کی رسائی میں خلل انداز ہوئے تھے، اس لیے نظیری نے اپنا مستقل تعلق خان خاناں کے دربار سے قائم رکھا اور اس کی نوازشات سے متمتع ہوتا رہا، بعد میں احمد آباد گجرات میں اس نے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، وہ حج بیت اللہ سے بھی شرف یاب ہوا تھا اور تفسیر و حدیث کا علم بھی رکھتا تھا، وہ اپنا دیوان خان خاناں کو حوالہ کرکے ۱۰۲۳ھ میں احمد آباد ہی میں فوت کر گیا اور اپنے مکان کے قریب اپنی تعمیر کردہ مسجد کے احاطہ میں سپرد خاک ہوا۔ (۳)

طالب آملی: یہ بھی ایران کا ایک خوش کلام شاعر گزرا ہے، مازندران کے شہر آمل کا

باشندہ تھا، عہد طفولیت میں درسی علوم و فنون کی تعلیم حاصل کی اور اپنے دعوے کے مطابق ۱۶ سال کی عمر میں اس نے ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف اور خوش نویسی میں کمال حاصل کرلیا تھا لیکن شاعری کو اپنا اصل فن قرار دیا، کاشان میں اس کی مستقل سکونت تھی لیکن بعد میں وہ مختلف علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے ہندوستان آیا اور خوش قسمتی سے وہ جہاں گیر کے درباری شعرا میں شامل ہوا اور ملک الشعرا کا خطاب حاصل کیا اور نہایت عزت و احترام سے زندگی بسر کی، جہاں گیر کے انتقال سے ایک برس قبل ۱۰۳۶ھ میں عین حالت شباب میں اس نے وفات پائی (۴)

،مرزا غالب اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں رقم طراز ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے "طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کردیا اور نظیری نے اپنی خاص روش پر مجھ کو چلنا سکھایا"۔ (۵)

اب ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو جو میر فضل علی کی وفات سے متعلق ہے، غالب کو ان سے بڑی خاطر داری تھی، جب ہی تو ان کی موت پر بڑے ہی گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا ہے، غالب یوں ماتم کناں ہیں۔

چو میر فضل علی را نماند ست وجود — تو روی دل بخراش ای اسیر رنج و محن
چو شد وجود گم و روی دل خراشیده — شود ز اسم خودش سال رحلتش روشن (۶)

ترجمہ: (جب میر فضل نہیں رہے تو رنج و غم سے نڈھال دل بھی زخمی ہوکر رہ گیا ہے، آہ! فضل علی زخمی دل دے کے رخصت ہوگیا، اس کے نام ہی سے اس کا سال وفات ظاہر ہے)

میر فضل علی: یہ دراصل دلی کے باشندے تھے جو لکھنؤ چلے گئے تھے اور وہاں شاہ اودھ کے ملازم رہ کر ترقی کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۸۲۹ء میں نواب غازی الدین حیدر کے عہد میں وزیر اعظم کے عہدۂ جلیلہ سے ممتاز و سرفراز ہوئے اور پندرہ مہینے قلم دان وزارت ان کے سپرد رہا، انہوں نے ایک لاکھ ستر ہزار روپے اہل دہلی کی تعلیم کے لیے گورنمنٹ کی تحویل میں دیا، اس گراں قدر عطیہ کے بعد ہی لکھنؤ ہی میں میر فضل علی کا انتقال ہوگیا اور حسب وصیت وہیں میر خدا بخش کے کربلا میں مدفون ہوئے۔ (۷)

غالب ہمیشہ اپنے محسنین اور کرم فرماؤں کے بار احسان سے خمیدہ سر رہے، جس کسی نے

بھی انہیں انعام واکرام سے نوازا وہ اس کے مداح اور بہی خواہ ہوگئے اور اعتراف احسان کے عوض اس کی سخاوت اور دریا دلی کے نغمے الاپتے رہے، ذیل کا قطعہ جو نواب سید کلب علی خان بہادر سے منسوب ہے اس میں غالب نے نواب موصوف کے بے پناہ جود وسخا کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کی بلندیٔ اقبال اور حشمت و جاہ سے متعلق اپنی دلی تمنا اور نیک خواہشات کا اظہار کیا ہے، نواب موصوف کو بھی غالب سے بڑی عقیدت تھی اور وہ ہمیشہ غالب کو نوازتے رہتے تھے، قطعہ کیا ہے گویا نواب کی فیاضی اور سخاوت کا آئینہ دار ہے۔

داد و دہش تو روز افزوں باد   بر دولت تو زمانہ نہ مفتون باد
ایں عید و دو صد ہزار عید دگر   بر ذات تو فرخ و ہمایوں باد (۸)

ترجمہ: (آپ کی سخاوت وفیاضی میں روز بہ روز اضافہ ہوتا رہے اور اہل زمانہ آپ کی دولت اور حکومت پر فریفتہ ہوتے رہیں، یہ ایک خوشی کا موقع ہے اور اس طرح سے ہزاروں لاکھوں عیدیں آپ کی ذات پر خوشیاں لٹاتی رہیں)

نواب کلب علی خاں: نواب سید محمد کلب علی خاں بہادر خلد آشیاں نواب سید یوسف علی خاں بہادر فردوس مکاں کے فرزند اکبر تھے، ۲۰ رذی الحجہ ۱۲۵۰ھ/۱۹ راپریل ۱۸۲۵ء کو بہ روز اتوار بہ وقت صبح آپ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے، ۳۰ سال کی عمر میں آپ گورنر جنرل کی منظوری کے بعد بحیثیت ولی عہد ریاست مسند نشیں ہوئے، آپ بڑے حاتم دل، پابند شرع، با مروت اور خلیق الطبع تھے، صاحب علم ہونے کے باعث آپ کا دربار اہل علم وکمال سے ہمیشہ بھرا رہتا تھا، فارسی ادبیات سے زیادہ تعلق خاطر تھا اور اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے اور نواب تخلص فرماتے تھے، مرزا غالب ان کی طرز نگارش کے بہت مداح تھے، تصنیفات میں چار اردو کے دیوان کے علاوہ دیوان فارسی، تاریخ شاہان سلف، انتخاب بوستان خیال اور متعدد نثری تصنیفات ہیں، ۲۲ رسال اور ۷ ماہ کی حکم رانی کے بعد ۵۳ سال ۶ ماہ اور ۷ روز کی عمر میں بہ روز بدھ بہ وقت ۳ بجے سہ پہر ۲۷ رجمادی الآخر ۱۳۰۴ھ/ ۲۳ رمارچ ۱۸۸۷ء کو اس دار فانی سے رخت سفر باندھا۔(۹)

اب ذیل میں دو قطعات درج کیے جارہے ہیں جو سورت کے حکم راں میر غلام بابا خان

سے منسوب ہیں:

فتح سید غلام بابا خان   خود نشان دوام اقبال است
ہم ازیں رو بود کہ غالب گفت   کہ ظفرنامۂ ابد سال است (۱۰)

ترجمہ: (سید غلام بابا خان کی فتح خود ان کی اقبال مندی کی نشان ہے، اس سے متاثر ہوکر غالب نے ان کے حق میں یہ قطعہ لکھا اور ہمیشہ انہیں کامیاب رہنے کی دعا دی)

میر بابا یافت فرزندی کہ ماہ چار دہ   بر فراز لوح گردوں گردۂ تمثال اوست
فرخی بینی و یابی بہرہ از ناز و طرب   از سر ناز وطرب "فرزند فرخ" سال اوست (۱۱)

ترجمہ: (میر بابا کو خدا نے ایک فرزند عطا کیا جو ۱۴ مہینے کا ہے، آسمان کی اونچی تختی پر اس کا نام ثبت ہوگیا ہے، اس خوشی اور سعادت کے موقع پر آپ کو ناز وطرب سے معمور فرزند مبارک ہو)

قطعہ اول میں غالب نے میر غلام بابا خان کو تہنیتی الفاظ سے نوازا ہے، غالباً کسی مقدمہ میں بمبئی کی عدالت عالیہ میں بابا خان کی فتح ہوئی تھی اور انہیں مزید عز وجاہ سے نوازا گیا تھا، بمبئی کے ایک روزنامہ میں جب غالب کو میر بابا خان سے متعلق یہ خوش آیند خبر پڑھنے کو ملی تو ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، غالب کو بابا خان سے تعلق خاطر داری تھی چنانچہ انہوں نے ان کی بلند اقبالی اور فتح وظفر پر اظہار مسرت کرتے ہوئے مذکورہ قطعہ لکھ کر میر بابا خان کی خدمت میں ارسال کردیا، دوسرا قطعہ میر بابا خان کے گھر فرزند تولد ہونے پر بہ طور مبارک بادی کے ہے جس میں نومولود کی تاریخ پیدائش (۱۲۸۰ھ) کے تذکرے کے ساتھ اس کی درازی عمر اور صحت و سلامتی کی دعائیں مانگی گئی ہیں۔

میر غلام بابا خان: یہ سورت کے حکم راں تھے، ان کی پیدائش ۴ رشعبان ۱۲۵۰ھ/۶ ردسمبر ۱۸۳۴ء کو سورت میں ہوئی تھی، ان کے والد سید اخی قاضی شہر اور درگاہ سید جمال الدین کے سجادہ نشیں تھے، جب ۲ رربیع الثانی ۱۲۶۴ھ/ ۸ رمارچ ۱۸۴۸ء کو ان کا انتقال ہوگیا تو ان کی تعلیم وتربیت کی ذمہ داری ان کے بڑے بھائی نے اٹھائی، میر غلام بابا خاں گرچہ خود نہیں کہتے تھے مگر شاعروں اور ادیبوں کے قدردان اور متکفل تھے، غالب سے بھی خط وکتابت رہی اور گاہے گاہے ان سے سلوک بھی کرتے رہے، ۱۲ رشوال ۱۳۱۰ھ/ ۲۹ راپریل ۱۸۹۳ء کو ان کا انتقال

ہوااوراپنے خاندانی قبرستان درگاہ حضرت سید جمال الدین عرف خواجہ دیوانہ (دانا) میں مدفون ہوئے۔(۱۲)

اب ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو جو ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل نواب بہادر لارڈ ولیم کونڈس بینٹنگ سے متعلق ہے، یہ قطعہ نواب موصوف کی ہندوستان تشریف آوری کے موقع پر کہا گیا ہے، جس میں غالب نے نواب صاحب کے رعب وجلال، ان کی مخلوق پروری اور منصف مزاجی کی عکس کشی نہایت شاعرانہ حسن سے کی ہے۔

داور شاہ نشاں لارڈ کونڈس بینٹنگ	کز نہیبش تپش از شعلہ رمیدن دارد
ہر کجا برق عتابش علم افراشتہ است	شعلہ را رعشہ بر اندام دویدن دارد
اندرین سال مبارک ز غبار رہ خویش	بر رخ ہند سر غازہ کشیدن دارد
باخود گفتم اگر سال ورودش در ہند	باز جوئی و بگوئی کہ شنیدن دارد
گفت نواب ز آغاز و ز انجام و رود	از کرم جان بہ تنِ خلق دمیدن دارد (۱۳)

ترجمہ: لارڈ کونڈس بینٹنگ انصاف پرور بادشاہ ہے، اس کے ہیبت وجلال کے آگے شعلہ بھی جلنے کی تاب نہیں رکھتا، ہر جگہ اس کے غیظ وغضب کا جھنڈا لہرا رہا ہے، یہاں تک کہ اس کے غضب کی بجلی اور شعلہ میں کپکپی طاری ہے، کتنا مبارک ہے یہ سال جس میں اس کی غبار راہ ہندوستان کے چہرے پر پاوڈر مل رہا ہے، ہندوستان میں اس کی آمد کے موقع پر میں نے یہ قطعہ کہا ہے جو کہنے اور سننے سے تعلق رکھتا ہے، نواب نے اپنی آمد سے یہاں یہ خوش گوار ماحول پیدا کردیا ہے کہ شروع سے اخیر تک عوام کا ہر طبقہ راحت وخوشی محسوس کررہا ہے)

لارڈ بینٹنگ (Bentink, Lord William Cvendish): یہ پورٹ لینڈ کے III Duke کے چشم وچراغ تھے، ۱۴ر ستمبر ۱۷۷۴ء کو یہ صفحۂ ہستی پر جلوہ گر ہوئے، ۱۷۹۱ء میں وہ فوجی ملازم ہوگئے اور کئی سال تک اٹلی میں فوجی ملازم رہے، اس کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور ۱۸۰۳ء سے ۱۸۰۷ء تک مدراس کے گورنر رہے، پھر ۱۳ سال تک سبک دوش رہنے کے بعد جولائی ۱۸۲۸ء سے مئی ۱۸۳۳ء تک بنگال کے گورنر رہے، اس کے بعد نومبر ۱۸۳۴ء سے مارچ ۱۸۳۵ء تک وہ ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اس عہدۂ جلیلہ پر فائز

ہوئے اور بہت سارے قابل قدر امور انجام دیے، بالخصوص تعلیم وتربیت، ملازمت اور معیشت کی طرف انہوں نے خصوصی توجہ دی جس کی وجہ سے عوام نے انہیں اپنا ہر دل عزیز رہنما تسلیم کرلیا، آخرکار ۱۷ر جون ۱۸۳۹ء کو رفاہ عامہ کے کاموں سے خستہ حال ہوکر وہ ابدی نیند سو گئے۔(۱۴)

فروغ طالعِ ایام مستر استرلنگ	کہ فر خسرویش تاقی چو خورز جبیں
شگفتہ روی و پسندیدہ خوی وشکلیں بوی	بہ رای نیک و بہ گوہر خوش وبشیوہ گزیں
بدہر زد سرپای وجاں بجانان واد	ز خود گزشت ببال نگاہ باز پسیں
بصد نشاط سی و پنجم سالہ از دنیا	جریدہ رفت و جواناں چنیں روند چنیں
بہ روز بست و سوم از مئی بہ ہنگامی	کہ بود خسرو انجم ببرج ثور مکیں
ہزار ہشتصدوسی ز عہد عیسیٰ بود	کہ جست برق جہاں سوز ایں الم زکمیں
نرفتہ نقش خیال وی و نخواہد رفت	ز خاطر اسد اللہ داد خواہ حزیں (۱۵)

ترجمہ: (مسٹر اسٹرلنگ کی بلندی اقبال کا یہ زمانہ ہے کہ سورج بھی اپنی پیشانی ان کی شانِ خسروی کے آگے خم کیے ہوئے ہے، کتنا ہنس مکھ اور پسندیدہ خصلتوں کا حامل یہ حکم راں ہے جس کے دل پسند طرز وروش اور گفتگو سے موتی جھڑتے ہیں، اس کے انداز حکم راں پر عوام فدا ہے اور دل ونگاہ میں ہردم اسے بسائے ہوئے ہے، وہ ۳۵ سال کی عمر تک خوشی خوشی حکم رانی کرکے اس دنیا سے رخصت ہوگیا، مئی کی ۲۳ تاریخ تھی کہ اس کی زندگی کا ستارہ ماند پڑگیا اور ۱۸۳۰ء کا زمانہ تھا کہ اسی سال اس نے دنیا کو خیرباد کہا، اب تک اس کا خیال نہ گیا اور نہ جائے گا، اسداللہ کو اسی خاطرداری کا ملال ہے)

قطعہ مذکور مسٹر اسٹرلنگ بہادر کی وفات سے متعلق ہے جس میں غالب نے اسٹرلنگ کے خسروانہ طرز حکومت، اس کی شگفتہ روی، پسندیدہ اخلاق وطرز وروش، شیریں بیانی اور اصابت رائے کے علاوہ اس سے اپنی بے پناہ عقیدت ومحبت اور اس کی مرگ ناگہانی پر اپنے گہرے دکھ اور صدمے کا اظہار کیا ہے۔

اسٹرلنگ انڈریو (Stirling Andrew): یہ Admiral Andrew کا فرزند تھا جس

کی پیدائش ۱۷۹۳ء میں ہوئی تھی، تحصیل علم کے بعد وہ ۱۸۱۳ء میں ہندوستان آیا اور ۱۸۲۸ء میں حکومت ہند کی خدمت گزاری پر مامور ہوگیا، اس مدت میں وہ کلکتہ میں گورنمنٹ کے چیف سکریٹری کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض انجام دیتا رہا، اسی زمانہ میں مرزا غالب کلکتہ میں تھے، انہوں نے اپنی خاندانی پنشن کی بحالی کے لیے کلکتہ کونسل میں اسٹرلنگ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا، اسٹرلنگ غالب کا بہت مداح تھا اور اس نے ان کی مدد کا وعدہ کیا لیکن شومئی قسمت اسٹرلنگ عین عالم شباب میں جب کہ زندگی کی صرف ۳۵ بہاریں وہ دکھا چکا تھا، ۳۰ رمئی (قطعہ میں ۲۳ رمئی درج ہے) ۱۸۳۰ء کو کلکتہ ہی میں داغ مفارقت دے گیا، وہ فارسی زبان سے بہت اچھی طرح واقف تھا اور حد درجہ سخن فہمی اور سخن سنجی میں اسے کمال حاصل تھا۔ (۱۶)

غالب کے ہم عصر ایک بزرگ تھے جن کا نام حضرت سید غوث علی شاہ قلندر تھا وہ قصبہ استھانواں بہار کے باشندہ تھے، ۱۲۱۹ھ میں ان کی ولادت ہوئی اور ۱۲۹۷ھ میں وہ رحلت فرما گئے، یہ بڑے جہانیان جہاں گشت تھے اور سلسلہ قادریہ کے مشہور بزرگوں میں ان کا شمار ہوتا تھا، یہ اس زمانے کی بات ہے جب شاہ صاحب دہلی گئے ہوئے تھے اور دریا گنج کی زینت المساجد میں فروکش تھے، وہاں ان کا قیام تقریباً ۶ ماہ تھا وہ پہلی مرتبہ خود ہی مرزا سے ملنے گئے تھے اور اس کے بعد سے مرزا بھی ان سے برابر ملاقات کرتے رہتے، ان ملاقاتوں کا بڑا اچھا اثر شاہ صاحب پر پڑا، ان کے ملفوظات تذکرۂ غوثیہ میں دو مقام پر مرزا غالب کا ذکر ہے اور جس انداز میں انہوں نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اور غالب کے اخلاق وعادات کی تصویر جس طرح کھینچی ہے اس سے غالب ہی نہیں خود شاہ صاحب کے اعلا اخلاق پر روشنی پڑتی ہے، ورنہ ان دونوں کا کیا میل، مرزا ایک رند مشرب آدمی اور شاہ صاحب اپنے وقت کے بڑے اہل دل بزرگ، ان کے ملفوظات میں مرزا غالب کے اشعار بھی ملتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں مرزا سے کتنی محبت تھی، مرزا کے انتقال کی خبر سن کر شاہ صاحب اپنے ایک ملاقاتی سے یوں اپنے دلی تاثر کا اظہار کرتے ہیں:

"نہایت خوب آدمی تھے، عجز وانکسار بہت تھا، فقر دوست بہ درجۂ غایت اور خلیق از حد تھے، رند مشرب بے شر، رحم دل تھے اور فن شاعری میں اپنا

جواب نہ رکھتے تھے لیکن افسوس یہ ہمارے محب بھی چل دیئے"۔

شاہ صاحب جب مرزا سے ملنے گئے تھے تو مرزا نے اپنے دو قطعات انہیں نذر کیے تھے، وہ قطعات درج ذیل ہیں، ایک میں مرزا نے اپنے آپ کو گناہ گار اور سیاہ کار کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے بہ روز حشر خدا سے اپنی مغفرت کی طلب کی ہے جب کہ دوسرے قطعہ میں اس نے ناصح اور واعظ کا کردار ادا کرتے ہوئے لوگوں کو شراب اور ناچ گانے سے احتراز کرنے کی تلقین کی ہے جو لوگوں کو اپنے فریب میں مبتلا کر کے دین وایمان سے بیگانہ کر دیتے ہیں، اس کے علاوہ اس نے فرصت کے اوقات کو خدا کی بندگی اور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نذرانۂ درود پیش کرتے رہنے کی تلقین ونصیحت کی ہے، قطعات کتنے ایمان افروز ہیں ملاحظہ فرمائیں۔

بہ روز حشر الٰہی چو نامۂ عملم　　کنند باز کہ آن روز باز خواہ من است
بکن مقابلہ آن وا ز سرنوشت ازل　　اگر زیادہ وکم باشد آن گناہ من است

ترجمہ: (الٰہی حشر کے دن جب تو میرا نامۂ اعمال کھولے اور مجھ سے باز پرس ہو تو تمام گناہ گاروں سے میرا مقابلہ کرتے ہوئے گناہ گاروں میں میرا نام سر فہرست درج کر اور جس کے گناہ کم ہوں یا زیادہ ہوں ان سب کو میرے حصے میں ڈال دے کیوں کہ میں سب سے زیادہ سیاہ کار ہوں)

فرصت اگر دست دہد مغتنم انگار　　ساقی و مغنی و شرابی و سرودی (۱۷)
ز نہار ازان قوم نہ باشی کہ فریبند　　حق را بہ سجودی و نبی را بہ درودی

ترجمہ: (اے شرابی، شراب پلانے والا، ناچنے اور گانے والا، اگر تجھے کبھی فرصت ملے تو ان اوقات کو غنیمت جانتے ہوئے بارگہ خداوندی میں سجدہ ریز ہو اور نبی محترم ﷺ پر نذرانۂ درود بھیجتا رہ اور کبھی بھی ایسے بدکردار لوگوں کی صف میں شامل ہونے کی کوشش نہ کر کیوں کہ یہ سب فریبی ہیں اور تجھے راہ راست سے گم کر دینے والے ہیں)

اب ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو جو بنام نواب کلب علی خان بہادر کے نام ایک خط میں درج ہے، غالب کو جب اخبار وغیرہ کے ذریعہ معلوم ہوا کہ نواب مہدی علی خاں بہادر حسب الحکم گورنمنٹ اجلاس کونسل کی خاطر کلکتہ تشریف لے جائیں گے تو غالب کو نمک خواری، دعا گوئی اور مدح گستری کا ایک بہانہ ہاتھ آیا، لہذا اجلاس کونسل کی تقریب کی مناسبت سے ۱۸ رنومبر ۱۸۶۶ء کو

ایک قطعہ لکھ کر حضرت نواب کو نذر کیا جس میں ان کی تعریف وتوصیف کے ساتھ ان کے دشمنوں اور حاسدوں پر نفرین بھی ہے، قطعہ یہ ہے۔

چو نواب از بہر اجلاس کونسل　　　بہ کلکتہ ازرام پور آورد رُخ
عدو را بگیرد بکش زود و یرا　　　بجو سال اجلاس از "بخت فرخ"
چو گویند کز کشتن وی چہ خواہی　　　بگو رفع اعداد وی انیت پاسخ (۱۸)

۱۸۶۶ء

ترجمہ: (یعنی نواب صاحب اجلاس کونسل میں شرکت کی غرض سے رام پور سے کلکتہ تشریف لائے ہیں، خدا کرے کہ ان کے دشمن جلد ہی گرفتار ہو کر مارے جائیں، ان حاسدوں اور دشمنوں سے پوچھا جائے کہ تم سب نواب موصوف کے پیچھے پڑے کیوں ہو، انہیں مار کر تمہیں کیا ملے گا)

نواب مہدی علی خاں بہادر: صاحب زادہ سید مہدی علی خاں بہادر نواب سید غلام محمد خاں بہادر کے پوتے، صاحب زادہ سید حفیظ اللہ خاں بہادر کے بیٹے اور نواب خلد آشیاں کے چچا تھے، شعر وسخن کا ذوق اور نحیف تخلص کرتے تھے، ابتدا میں نواب فردوس مکاں سے تلمذ تھا، اخیر میں میر احمد علی رسا کے شاگرد ہوئے، ۴۷ برس کی زندگی گزار کر ۲۷ رمضان المبارک ۱۲۸۹ھ/ ۱۸۷۲ء کو رحلت فرمائی۔ (۱۹)

ایکہ شایستۂ آنی کہ تری　　　جم و فغفور و سکندر گویم
چوں نداری سرشاہی ناچار　　　حاکم و والی و داور گویم
جلوۂ روی دل افروز ترا　　　مہر یا ماہ منور گویم
زاں نیارم کہ بہ اندازۂ شوق　　　مدح نواب گورنر گویم (۲۰)

ترجمہ: (اے لائق وفائق حکم راں تجھے ہم جم، فغفور اور سکندر سے تشبیہ دیتے ہیں اور تجھے حاکم، والیٔ سلطنت اور انصاف پرور بادشاہوں کی صفوں میں کھڑا کرتے ہیں، تیرا یہ پروقار اور دل افروز چہرہ ہے جسے سورج یا ماہ منور کہا جائے تو بہتر ہے، تجھ سے میری دلی محبت اور ہمدردی کا یہ تقاضا ہے کہ میں تیری تعریف وتوصیف بیان کروں)

مذکورہ قطعہ جیمس تامسن والیٔ آگرہ سے متعلق ہے، جس میں اس کی پروقار اور دیدہ زیب

شخصیت کی تصویر کشی کرتے ہوئے اس کی عدل گستری کا نغمہ گایا گیا ہے نیز اس کی مدح وثنا میں زمین وآسمان کے قلابے ملاتے ہوئے اسے دنیا کے عظیم المرتبت شہنشاہوں مثلاً جمشید، فغفور اور سکندر کی صف میں لا کھڑا کیا گیا ہے۔

جیمس تامسن (Thomason James): یہ جب والی آگرہ مقرر ہوا تو غالب کو اس سے بڑا فیض پہنچا، وہ ان کی بہت قدر کرتا تھا، درج بالا قطعہ اس کے حاکم آگرہ مقرر کیے جانے پر بطور تہنیت کہا گیا تھا، جیمس تامسن کی پیدائش ۳ مئی ۱۸۰۴ء کو ہوئی تھی، وہ Rev Thomas کا بیٹا تھا، حصول تعلیم کے بعد ۱۸۲۲ء میں وہ ہندوستان آیا اور صدر کورٹ کا رجسٹرار مقرر ہوا، پھر ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۲ء تک وہ گورنمنٹ کا سکریٹری رہا، ۱۸۳۲ء سے ۱۸۳۷ء تک وہ اعظم گڈھ کے مجسٹریٹ کلکٹریٹ کے عہدے پر فائز رہا، ۱۸۳۷ء سے ۱۸۴۱ء تک اس نے آگرہ گورنمنٹ کے سکریٹری کی حیثیت سے فرائض انجام دیے، ۱۸۴۱ء میں وہ ریونیو بورڈ کا رکن منتخب ہوا، پھر ۱۸۴۲ء سے ۱۸۴۳ء تک وہ خارجہ سکریٹری کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں نبھاتا رہا اور دسمبر ۱۸۴۳ء سے ستمبر ۱۸۵۳ء تک شمال مغربی صوبوں کے لفٹنٹ گورنری کی ذمہ داری اس کے سپرد رہی، وہ جہاں بھی رہا ہر جگہ قابل قدر کارنامے انجام دیتا رہا اور بہت ہی کامیاب حکم راں کی حیثیت سے بالآخر ۲۹ ستمبر ۱۸۵۳ء کو بریلی میں اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ (۲۱)

جَم: یہ جمشید کا مخفف ہے جو ایران کا مشہور بادشاہ تھا، اس کا اصل نام جم تھا۔

سکندر: یہ یونان کا مشہور بادشاہ گزرا ہے جس نے دارا پر فتح پائی اور ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔

فغفور: یہ اشکانی خاندان کے بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا جو سکندر کے بعد تخت پر بیٹھا اور ۶۲ سال تک حکومت کی۔ (۲۲)

جان جاکوب بہادر کہ زیزداں دارد　　　خوبی خوی و فرو زندگی جوہر رائی
طالعش جود بود تا بہ نظر گاہ کمال　　　مشتری سوی سعادت بودش راہ نمای
آن کہ این اختر مسعود نگارد غالب　　　بہر تحریر مداد آورد از ظل ہمای (۲۳)

ترجمہ: (جان جیکوب بہادر جسے خدا نے نیک خصلت، ذہانت اور فہم وتدبر کے جوہر سے نوازا

ہے نظر گاہ کمال تک اس کی جود و سخا کا فیضان عام ہے اور اس کی قسمت کا ستارہ اسے نیک بختی کی طرف راہ دکھا رہا ہے، یہی سبب ہے کہ غالب نے اس مبارک موقع پر خدا کی مدد سے قلم ہاتھ میں لے کر قطعہ نگاری کی ہے)

مذکورہ قطعہ جان جاکوب بہادر کے تعلق سے ہے، مرزا غالب کو اس فرنگی حاکم سے تعلق خاطر تھا، اس قطعہ میں غالب نے فرنگی موصوف کی سعادت مندی نیز اس کے شاہانہ جاہ و جلال اور قدر و منزلت کا تذکرہ کرتے ہوئے خود اپنے آپ کو بھی اقبال مند اور خوش نصیب شمار کیا ہے جو اس قطعہ کی تحریر کا موجب اور محرک بنا۔

میجر جان جیکب (Major John Jacob): یہ گوالیار میں فوجی خدمت پر مامور تھا اور ۱۸۵۸ء کی شورش کے دوران وہیں جوانی ہی میں مارا گیا، "پنج آہنگ" اور "باغ دودر" میں ان کے نام غالب کے خطوط دونوں کے درمیان رابطہ اخلاص کے شاہد ہیں، غالب نے ان کے مرتب کیے ہوئے "دیوان حافظ" پر تقریظ اور ان کی فرمائش پر بعض تاریخی قطعات بھی لکھے ہیں، "باغ دودر" میں شامل ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ جیکب شاعر بھی تھے اور مرزا غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لیا کرتے تھے۔ (۲۴)

اب ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو جس میں دہلی کے بیگم باغ میں چراغاں کی تصویر کشی کی گئی ہے، یہ قطعہ غالب کی جانب سے منشی شیو نرائن آرام کے نام ایک خط میں درج ہے، بہ قول غالب یکم نومبر ۱۸۵۹ء دوشنبہ کے دن رات کے وقت تمام خیر خواہان انگریز کو حکم ہوا کہ وہ اپنے اپنے گھروں میں روشنی کریں اور بازاروں میں اور صاحب کمشنر بہادر کی کوٹھی پر بھی روشنی ہوگی، فقیر بھی اسی تہی دستی میں کہ اٹھارہ مہینے سے پنشن مقرری نہیں پاتا، اپنے مکان پر بھی روشنی کرے گا اور ایک قطعہ پندرہ بیت کا لکھ کر صاحب کمشنر شہر کو بھیجا ہے۔ (۲۵)

درین روزگار ہمایوں فرخ — کہ گوئی بود روزگار چراغاں
شد گوش پرنور چوں چشم بینا — ز آوازۂ اشتہار چراغاں
شد از حکم شاہنشہ انگلستان — فزوں رونق کاروبار چراغاں
جہاں دار وکٹوریہ کز فروغش — ز آتش دمد لالہ زار چراغاں

ز عدلش چناں گشتہ پروانہ ایمن — کہ شد دیدبان حصار چراغاں
بہ فرماں سر جان لارنس صاحب — شد ایں شہر آئینہ دار چراغاں
بہ دہلی فلک رتبہ سانڈرس صاحب — برآراست نقش و نگار چراغاں
شد از سعی ہنری اجرٹن بہادر — رواں ہر طرف جوئبار چراغاں
سخن سنج غالب ز روی عقیدت — دعا میکند در بہار چراغاں
کہ باد افزوں سال عمر شہنشہ — بروی زمیں از شمار چراغاں (۲۶)

ترجمہ: (آج اس پر مسرت اور مبارک موقع پر جو چراغاں کا دن ہے حاکم وقت انگلینڈ کی جانب سے چراغاں کی خبر سے لوگوں کی آنکھیں نور کی طرح منور ہوگئی ہیں، ہر طرف چراغاں سے رونق بازار ہے اور شہنشاہ مملکت ملکۂ وکٹوریہ جن کے دم سے عدل و انصاف اور امن و سلامتی کو ملک میں فروغ حاصل ہوا ہے، آج اس خوشی میں ہر جانب چراغاں ہی چراغاں ہے، حاکم وقت سر جان لارنس صاحب کے حکم سے آج شہر کا گوشہ گوشہ بقعۂ نور بنا ہوا ہے اور عالی مرتبت سانڈرس صاحب کے فرمان کے مطابق شہر دہلی کو نقش و نگار اور چراغاں سے آراستہ کیا گیا ہے اور ہنری اجرٹن بہادر صاحب کی کوششوں ہی کا نتیجہ ہے کہ شہر میں ہر طرف روشنی کے دریا بہا دیے گئے ہیں، اس پر بہار اور دیدہ زیب چراغاں کے موقع پر غالب بھی عقیدت سے اس امر کے لیے دعا گو ہے کہ زمین پر چراغاں کی جتنی قندیلیں روشن ہیں اسی حساب سے شہنشاہ وقت کی عمر میں اضافہ ہو)

قطعہ کیا ہے گویا جشن چراغاں کا آئینہ دار ہے، اس میں غالب کی بے پناہ عقیدت اور فرط مسرت کے جذبات نمایاں ہیں، چراغاں کی عکس کشی کے علاوہ شہنشاہ کے لیے درازی عمر کی دعائیں اور خراج عقیدت وتحسین سے اس کی نوازش قطعہ مذکور غالب کی قصیدہ خوانی کی ایک عمدہ مثال ہے، اب درج ذیل توضیحی نوٹ پر توجہ مرکوز ہو۔

بیگم باغ: اس کا نام ملکہ کا باغ یا بیگم کا باغ ہے جسے جہاں آرا بیگم نے ۱۰۶۰ھ میں آراستہ کیا تھا جو چاندنی چوک کے بازار میں گھنٹہ گھر کے سامنے ہے، بعد میں میونسپل کمیٹی کے دفاتر یہاں کی عمارتوں میں منتقل ہو گئے تھے، اس لیے عام طور سے اسے "کمپنی باغ" بھی کہا جاتا ہے۔ (۲۷)

ملکۂ وکٹوریہ: انگلستان کی مشہور ملکہ ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئی اور ولیم چہارم کی وفات پر ۱۸ سال

کی عمر میں ۲۰؍جون ۱۸۳۷ء کو تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوئی، ۱۸۴۰ء میں جرمن شاہزادہ البرٹ سے اس نے شادی رچائی جو ۱۸۶۱ء میں فوت کر گیا، برطانوی سلطنت کی حدود اس کے عہد میں بڑی وسیع ہوگئی تھی، ادب، سیاست، مذہب اور تمدن کو اس نے بڑا فروغ دیا، ۱۸۷۶ء میں وہ ہندوستان کی ملکہ بنی اور ۱۹۰۱ء میں انتقال کر گئی۔(۲۸)

سر جانس لارنس (Sir John Lawrence): اس کے والد کا نام لفٹنٹ کرنل الکزنڈر لارنس تھا، ۴؍مارچ ۱۸۱۱ء کو اس کی پیدائش ہوئی، حصول تعلیم کے بعد وہ کلکتہ آیا اور فروری ۱۸۳۰ء میں اس نے سول سروس اختیار کی، پھر دہلی اور اس کے مضافات میں ۸ سال تک ضلع افسر کے معاون کی حیثیت سے اس نے اپنی خدمات انجام دیں، ۱۸۴۶ء میں ستلج (جالندھر) کے دوآبہ کا وہ کمشنر مقرر کیا گیا پھر لاہور میں ریزیڈنٹ کی حیثیت سے اس کا قیام رہا، ۱۸۴۹ء میں فتح پنجاب کے بعد وہ انتظامیہ بورڈ کا رکن منتخب ہوا، اس کے بعد لارڈ ڈلہوزی نے ۱۸۵۳ء میں اسے پنجاب کا چیف کمشنر بنادیا، پھر یکم جنوری ۱۸۵۹ء میں اسے پنجاب کا پہلا لفٹنٹ گورنر بنایا گیا اور بعد ازاں ۱۲؍جنوری ۱۸۶۴ء سے ۱۲؍جنوری ۱۸۶۹ء تک وہ ہندوستان کا گورنر اور وائسرائے مقرر کیا گیا، سر جانس لارنس کو انتظامی امور بالخصوص ریلوے، آب پاشی اور معاشی بہتری سے دل چسپی تھی، اس کی بہ دولت ان شعبوں میں کافی ترقی ہوئی، وہ بہت محنتی، ایمان دار، مخلص اور انتظامی امور کی صلاحیت کا حامل انسان تھا، اپنے عہدے سے سبک دوشی کے بعد وہ لندن چلا گیا اور وہیں ۲۷؍جون ۱۸۷۹ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گیا، کلکتہ اور لندن میں اس کے یادگار مجسمے نصب ہیں۔(۲۹)

سانڈرس (Saunders): جناب سانڈرس صاحب کمشنر بہادر دہلی تھے۔(۳۰)

ہنری اجرٹن (Egerton Philip Henry): یہ ولیم اجرٹن کا فرزند تھا، ۹؍اگست ۱۸۲۴ء کو اس کی پیدائش ہوئی، ۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۲ء تک اس نے Naval Military Academy میں تعلیم حاصل کی، اس کے بعد ہندوستان آیا اور ۱۸۵۰ء تک شمال مغربی صوبوں میں اس نے ملازمت کی اور ۱۸۵۵ء سے ۱۸۵۹ء تک وہ چار سال تک دلی میں Magte - Coller کے عہدے پر فائز رہا اور ۱۸۷۲ء میں وہ سبک دوش ہوکر ۱۷؍جنوری ۱۸۹۳ء کو فوت کر گیا۔(۳۱)

ایک مرتبہ مولانا الطاف حسین حالی نے مرزا کی بزرگی، استادی اور کبرسنی کے ادب و تعظیم کو بالائے طاق رکھ کر خشک مغز واعظوں کی طرح ان کو نصیحت کرنا شروع کی اور انہیں نماز پنج گانہ وغیرہ کی ادائیگی اور شراب و کباب سے باز رہنے کی تلقین کی جو مرزا کو ناگوار گزری اور ناگوار گزرنے کی وجہ یہ تھی کہ انہیں دنوں میں لوگ گم نام خطوں کے ذریعہ مرزا کے اعمال و افعال پر بہت نازیبا طریقے سے نفریں و ملامت کر رہے تھے اور بازاریوں کی طرح کھلم کھلا گالیاں کستے تھے، اس لیے حالی کی نصیحت ان کے لیے بار خاطر گزری اور ایک غزل حالی کے نام اور تخلص کی تصریح کیے بغیر حالی کے پاس بھیج دی جس کے مضامین اور اشارات سے معلوم ہوتا تھا کہ اس میں جو طعن و تعریض ہے وہ حالی ہی سے متعلق ہے، اس غزل کو پڑھ کر حالی کو اس بات کا موقع ملا کہ مرزا کے کمال شاعری کی نسبت ان کے جو خیالات ہیں اور جن کے اظہار کی کبھی نوبت نہیں آئی، ان کو کسی قدر شکایت کے ساتھ ایک مختصر قطعہ میں بیان کر کے مرزا کی خدمت میں بھیج دیں، جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اس زمانے میں حالی کو نواب محمد مصطفی خاں شیفتہ و حسرتی رئیس جہانگیر آباد سے تعلق خاطر تھا اور ان دنوں وہ دلی آئے ہوئے تھے اور حالی ان ہی کے مکان پر مقیم تھے، جب حالی کا لکھا ہوا قطعہ مرزا کی نظر سے گزرا تو انہوں نے جواباً نہایت لطیف قطعہ نواب موصوف کے پاس لکھ کر بھیج دیا جو ذیل میں درج ہے۔(۳۲)

تو ای کہ شیفتہ و حسرتی لقب داری — ہمی بہ لطف تو خود را امیدوار کنم
چو حالی از من آشفتہ بے سبب رنجید — تو گر شفیع نگر دی بگو چہ کار کنم
دوبارہ عمر دہندم اگر بفرض محال — براں سرم کہ دران عمر این دوکار کنم
یکی ادای عباداتِ عمرِ پیشینہ — دگر بہ پیش گہ حالی اعتذار کنم(۳۳)

ترجمہ: (اے شیفتہ اور حسرتی کے تخلص رکھنے والے تم سے میری امیدیں وابستہ ہیں، حالی بلاوجہ پریشان ہوکر مجھ سے رنجیدہ ہے، تم اگر میرے معاملے میں سفارشی نہیں بنتے ہو تو پھر میں کیا کروں اگر دوبارہ مجھے خدا (اس کبرسنی کے عوض صحت و توانائی سے معمور) زندگی عطا فرمائے تو خدا کی قسم اب دو ہی کام کرنے کی ٹھان لوں گا، ایک گزری ہوئی زندگی کی قضا عبادتیں (یعنی نماز وغیرہ) کا اہتمام اور دوسری حالی سے اظہار معذرت)

مذکورہ قطعہ میں دراصل اس امر کا اظہار ہے کہ حالی اور غالب کے مابین باہمی رنجش کو نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اپنے روابط و تعلقات کے ذریعہ دور کرنے کا سبب بنیں اور حالی نے بلا سبب اپنی جس رنجش کا اظہار کیا ہے، وہ نواب موصوف کی ثالثی سے ختم ہو، غالب نے اس قطعہ میں اس عزم کا بھی اظہار کیا ہے کہ خدا کی طرف سے دوبارہ اگر عمر میں اضافہ اور صحت و عافیت عطا ہو تو وہ دو کام ضرور بجا لائے گا، ایک خدا کی بندگی و عبادت اور دوسرے حالی سے اظہار معذرت، اس سے واضح ہوتا ہے کہ غالب اپنے طرز و روش سے کسی کو رنجیدہ اور کبیدہ خاطر دیکھنا نہیں چاہتے تھے، ان کی یہ نیک خوئی اور شرافت اعلاظرفی کی ایک عمدہ مثال ہے، اس کے علاوہ خدا کی بندگی اور اظہار عبادت کے ذریعہ نہ یہ کہ وہ فقط خوش نودی رب کے طالب تھے بلکہ وہ اپنی بھول چوک اور خطا و قصور کے ازالے کا اسے ایک ذریعہ بھی تسلیم کرتے تھے، بھلے ہی غالب صوم وصلوٰۃ کے پابند نہ رہے ہوں مگر کبھی کبھی بندگی و عبادت الٰہی کا یہ اظہار واحساس ان کے ایمان و اسلام کی علامت ہے۔

نواب مصطفےٰ خاں: ان کے والد کا نام نواب مرتضیٰ خاں بہادر تھا، نواب مصطفےٰ خاں ۱۲۲۱ھ/۱۸۰۶ء میں دہلی میں پیدا ہوئے، وہ عربی، فارسی دونوں زبانوں میں دست گاہ کامل رکھتے تھے، حدیث اور فن تجوید کا علم بھی حاصل کیا تھا، اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے، اردو میں شیفتہ اور فارسی میں حسرتی ان کا تخلص تھا، پہلے مومن سے اور ان کی وفات کے بعد غالب سے اصلاح لی، غالب سے ان کے بہت گہرے تعلقات تھے، غالب کو ان پر ناز تھا، وہ ان کی رائے کو خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے پایہ سخن سنجی کے معترف تھے، بہ قول حالی "اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد ان کے معاصرین میں سے کسی کی فارسی غزل ان کی غزل سے لگا نہیں کھاتی تھی"۔ ان کی کلیات جو اردو فارسی نظم و نثر پر مشتمل ہے، ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی، شیفتہ بلند پایہ نقاد سخن بھی تھے اردو شاعری کا مشہور فارسی تذکرہ "گلشن بیخار" ان ہی کی تصنیف ہے جو ۱۸۳۷ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی، شیفتہ کا انتقال ۶۳ برس کی عمر میں ذیابطیس کے مرض میں اکتوبر ۱۸۶۹ء/۱۲۸۶ھ میں ہوا۔ (۳۴)

مولانا حالی: اردو زبان و ادب کے معروف ادیب و شاعر کی حیثیت سے تاریخ ادب

اردو میں مولانا حالی کا نام زندۂ جاوید ہے، ان کی پیدائش ۱۸۳۷ء میں پانی پت (ہریانہ) میں ہوئی، حفظ قرآن مجید کے علاوہ عربی کی تعلیم بھی انہوں نے حاصل کی تھی، ۱۸۵۶ء میں پنجاب کے ایک ضلع حصار میں ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں انہوں نے ملازمت اختیار کرلی، شعر و ادب کا ذوق بچپن ہی سے تھا، صنف شاعری میں حالی کا مسدس "مدوجزر اسلام" ایک ایسا کارنامہ ہے جس میں بہت موثر انداز میں مسلمانوں کی ترقی اور تنزل کے اسباب شعر و سخن کے قالب میں بیان کیے گئے ہیں اور جو ایک قابل قدر اور ناقابل فراموش تاریخی یادگار ہے، آج بھی یہ کتاب مدارس اور اسکولوں میں داخل نصاب ہے، ملک اور قوم و ملت کا یہ بہی خواہ ۱۹۱۴ء میں راہ گزار ملک عدم ہوا۔ (۳۵)

اب ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو جو نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے نام یکشنبہ یکم اکتوبر ۱۸۶۵ء کے ایک خط میں درج ہے، نواب موصوف کو اپنے والد نواب امین الدین احمد خاں سے کسی امر پر رنجش ہوگئی تھی، بہت دنوں تک باپ بیٹے میں تعلقات کشیدہ رہے، خدا خدا کرکے دونوں کی رنجش دور ہوئیں اور دونوں باہم شیر و شکر ہوگئے، غالب نے اس موقعہ پر بہ طور تہنیت یہ قطعہ نواب موصوف کو ارسال کیا تھا جس میں باپ بیٹے کے مابین صلح و اتحاد پر بے پایاں دلی مسرت کا اظہار کیا گیا ہے اور اس مبارک صلح پر حوریان بہشت کے رقص کناں اور فرشتوں کی دعائے خیر سگالی کا تحفہ بھی نواب کے نذر کیا گیا ہے۔

شکر ایزد کہ ترا با پدرت صلح فتاد — حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
قدسیاں بہر دعای تو بود والا پدرت — "قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند" (۳۶)

ترجمہ: (خدا کا شکر ہے کہ باپ سے تیرا میل ملاپ ہوگیا، جنت کی حوریں اس مسرت کی گھڑی میں ساغر شکرانہ پی رہی ہیں اور فرشتے باپ بیٹے کے حق میں دعائے خیر کررہے ہیں اور مجھ دیوانہ کے نام یہ فال نکلا کہ اس پرمسرت اور مبارک موقع پر قطعہ لکھوں)

نواب علاء الدین احمد خاں علائی: یہ نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو کے فرزند تھے، ۲۵/اپریل ۱۸۳۳ء/۴/ذی الحجہ ۱۲۴۸ھ کو دلی میں ان کی پیدائش ہوئی، مرزا غالب انہیں بہت عزیز رکھتے تھے، اردوئے معلی اور عود ہندی میں علائی کے نام کئی خطوط ہیں، وہ اردو اور فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے، غالب نے انہیں ایک سند دی اور اپنا خلیفہ اور جانشین مقرر کیا، علائی

اپنے والد کی زندگی ہی میں لوہارو کے نواب ہو گئے تھے، بہ روز جمعہ ۱۱رمحرم الحرام ۱۳۰۲ھ/ ۳۱راکتوبر ۱۸۸۴ء کو نواب موصوف اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ (۳۷)

اب گجرات کے حکم راں نواب میر غلام بابا خاں کے نام ایک خط میں ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو جو نواب میر جعفر علی خاں بہادر کی وفات سے متعلق ہے، نواب موصوف ایک نام ور حکم راں تھا اور ہند و انگلستان میں اس کی حکومت کی دھوم مچی ہوئی تھی، بالفاظ غالب ''نواب میر جعفر علی خاں جیسا امیر روشن گر نام آور روشناس اعیان ہند و انگلینڈ وسط جوانی یعنی ۴۶ برس کی عمر میں یوں مرجائے گا''۔ (۳۸)

اب قطعہ دیکھیے غالب نے اس جواں سال نواب کی موت پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ دنیا کو روشنی بخشنے والا سورج آج تاریک ہوگیا، افسوس دوستوں کی آنکھوں کا یہ تارا ڈوب کر ساری دنیا کو غرق تاریک کرگیا، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ غالب اس واقعہ جانکاہ کی تاریخ رقم کرے۔

گر دید نہاں مہر جہاں تاب دریغ شد تیرہ جہاں بچشم احباب دریغ
ایں واقعہ را از روی زاری غالب تاریخ رقم کرد کہ ''نواب دریغ'' (۳۹)

۱۲۸۰ھ

مرزا اسد اللہ خاں غالب محقق تھے نہ مورخ لیکن اپنے قطعات میں انہوں نے جن مشہور زمانہ شخصیات بشمول سلاطین، امرا و حکام، شعرا و ادبا، علما و فضلا، بزرگانِ دین اور اعزہ و اقارب کا تذکرہ کیا ہے بلا شبہ وہ سب تاریخ کا اہم ترین حصہ تھیں جن کی طرف اشارہ کرکے غالب نے ہمیں ان کے احوال و آثار سے متعلق معلومات فراہم کرنے کا ایک موقع عنایت کیا ہے جس کی بنیاد پر ہم غالب کے قطعات کی تاریخی حیثیت متعین کرسکتے ہیں۔

مراجع

(۱) خلیق انجم: غالب کے خطوط (مرتبہ) ۴/ ۹۷، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ۱۹۹۳ء، لالہ سری رام: خم خانہ جاوید ۲/ ۲۷۵-۲۷۶، دہلی ۱۹۱۱ء۔ (۲) ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب: قاضی عبد الجلیل جنون، معارف اعظم گڈھ، ص ۲۶۸-۲۸۱، اکتوبر ۲۰۰۰ء (۳) علامہ شبلی نعمانی: شعر العجم، ۳/ ۱۳۴-۱۴۱، ۱۹۲۰ء،

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ (۴) ایضاً، ص ۱۶۵-۱۷۹ (۵) مولانا حالی، یادگار غالب، ص ۲۰۳ (۶) امیر حسن نورانی: کلیات غالب (مرتبہ) نول کشور لکھنؤ، ص ۲۷۶، ۱۹۶۸ء، (۷) حکیم محمد نجم الغنی رام پوری: تاریخ اودھ ۳/ ۱۳۲، مطبع العلوم مراد آباد، ۱۹۱۲ء، بشیر الدین احمد دہلوی: واقعات دار الحکومت دہلی، ۲/ ۵۷۱-۵۷۲، دہلی ۱۹۹۰ء، (۸) امیر حسن نورانی، ص ۳۱۱ (۹) امتیاز علی خاں عرشی: مکاتیب غالب (مرتبہ)، ص ۳۴ و ۳۵، رام پور ۱۹۴۳ء، (۱۰) نورانی، ص ۳۰۶ (۱۱) ایضاً، ص ۳۰۷ (۱۲) مالک رام: تلامذۂ غالب، ص ۲۹، دہلی ۱۹۸۴ء، (۱۳) نورانی، ص ۲۷۲ (۱۴) C. E. Buck land: Dictionary of Indian Biography، p. 36، Delhi، 1971 (۱۵) نورانی، ص ۲۷۰ (۱۶) مولانا غلام رسول مہر: غالب، ص ۱۵۱، لاہور ۱۹۴۶ء، (۱۷) پروفیسر مختار الدین احمد: احوال غالب، ص ۴۵-۴۸، نئی دہلی ۱۹۸۶ء، (۱۸) نورانی، ص ۳۰۰ (۱۹) عرشی: حواشی مکاتیب غالب، ص ۳۵ (۲۰) نورانی، ص ۲۴۷ (۲۱) Buck Land ص ۴۲۱ (۲۲) علی اکبر دہ خدا: لغت نامہ دہ خدا، ملاحظہ ہو حرف ''ج''-''س''، ''ف''-تہران، ۱۳۳۸ خورشیدی (۲۳) نورانی، ص ۲۵۸ (۲۴) حنیف نقوی: غالب احوال و آثار لکھنؤ، ۱۹۹۰ء، ص ۲۲۹ (۲۵) غالب: اردوئے معلی، ص ۲۸۴-۲۸۵ (۲۶) نورانی، ص ۲۸۰-۲۸۱ (۲۷) واقعات دار الحکومت دہلی ۲/ ۲۲۹ (۲۸) H. H. Dodwell : The Cambridge History of India، Vol 5، P.514، Delhi 1987 (۲۹) Buck land P.246 - 47 (۳۰) غلام رسول مہر، ص ۲۸۱ (۳۱) Buck land، P.133 (۳۲) حالی، ص ۴۷-۵۲ (۳۳) نورانی، ص ۳۰۹ (۳۴) تلامذۂ غالب، ص ۳۲۸-۳۳۶ (۳۵) حامد حسن قادری: تاریخ اردو، ص ۶۰۹، دہلی ۱۹۴۱ (۳۶) نورانی، ص ۳۰۹ (۳۷) حمیدہ سلطان احمد: خاندانِ لوہارو کے شعرا، ۸۱-۸۲، دہلی ۱۹۸۱ء۔ (۳۸) اردوئے معلی، ص ۵ (۳۹) نورانی، ص ۳۰۶۔

کلام حاتم اور ڈاکٹر اکبر حیدری کی تحقیق و تحریف

از:- پروفیسر عبدالحق ☆

شاہ حاتم دہلوی ہماری ادبی تاریخ میں اہم حیثیت رکھتے ہیں، ان کا کلام زبان و اسالیب کے بدلتے رجحانات اور رویوں کا ایک آئینہ خانہ ہے، جس میں کم و بیش پون صدی کی لسانی تاریخ کے نشیب و فراز محسوس کیے جاسکتے ہیں، انہیں شمالی ہند کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہونے کا فخر بھی حاصل ہے، بیسویں صدی میں ہمارے بزرگوں کی تحقیقی سرگرمیوں کے طفیل قدیم متون کی بازیافت سے متن شناسی کے نئے امکانات روشن ہوئے، فائز، آبرو، حاتم، ناجی، یکرو، یقین وغیرہ کے دواوین کی اشاعت سے قدیم متون کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہوا ہے، ڈاکٹر اکبر حیدری بھی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے کئی قدیم متون سے ہمیں روشناس کیا، ان کے محصولات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، خاص طور پر دیوان میر یا دیوان زادہ وغیرہ ان کی اہم دریافت ہیں، تحقیق میں تسامحات یا تبدیلیاں بھی ناگزیر ہوتی ہیں، علم نہ جامد ہے اور نہ تحقیق حرف آخر ہے، صبح کا صحیح شام کو غلط ہو جایا کرتا ہے، تحقیق و تنقید میں بھی یہ شب و روز کی تبدیلی کا تکوینی نظام کارفرما رہتا ہے مگر تحریف و تکذیب کو ہمیشہ مذموم سمجھا گیا۔

ڈاکٹر اکبر حیدری مسلکی تحقیق کے موید و مجاہد ہیں، ان کے مزعومات اکثر تحقیق کے استناد پر پورے نہیں اترتے، ان کی تحقیقات پہلی نظر میں چونکا دینے والے چٹکلوں کی طرح متاثر کرتی ہیں مگر بعد میں بے اثر ہو جاتی ہیں، ان کی ادعایت میں علمی وزن برقرار نہیں رہتا ہے، دیوان حاتم کے تعارف میں جگہ جگہ اس کوتاہی کا اظہار ہوا ہے، وہ نسخۂ محمود آباد کو بہ خط حاتم بتاتے ہیں مگر کسی اندرونی یا بیرونی شہادت کا ذکر نہیں کرتے، موصوف نے ترقیمہ کا بھی تذکرہ نہیں کیا ہے

☆ وزیٹنگ پروفیسر، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی، نئی دہلی۔

اور نہ اسے نقل کیا ہے، حاتم کی خودنوشت تحریر کے ثبوت بھی نہیں دیے گئے ہیں، انہیں پھر بھی بہ خطِ حاتم پر اصرار ہے، اگر مان بھی لیا جائے تو حاتم کی کسی خطی تحریر سے تقابل کر کے ہی فیصلہ کیا جاسکتا ہے، موصوف نے ۴۴ غزلوں کا ایک انتخاب بھی مقالے میں شامل کیا ہے جسے وہ غیر مطبوعہ کہتے ہیں، انہیں خیال نہ رہا ان غزلوں کا ایک معقول حصہ حسرت موہانی تقریباً ۴۵ سال قبل (۱۹۲۵ء) شائع کر چکے تھے[1]، ڈاکٹر حیدری کے انتخاب میں ۲۲ غزلیں ردیف الف کی ہیں، جن میں سے نو غزلیں حسرت موہانی کے انتخاب میں شائع ہو چکی ہیں یا پروفیسر زور کی ''سرگزشتِ حاتم'' یا تذکروں میں سینکڑوں اشعار کی نشان دہی کی گئی ہے، ان ۴۴ غزلوں کے انتخاب میں تقریباً نصف غزلوں میں ڈاکٹر حیدری نے سن اور بحر و اوزان لکھنے کا اہتمام کیا ہے اور باقی نصف کو نظر انداز کر دیا ہے جسے سہل پسندی کہا جاسکتا ہے، نسخۂ محمود آباد میں بھی سنین کے اندراج سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، مثلاً زمینِ کوکہ خان فغاں کی غزل پر ۱۱۶۳ھ درج ہے۔

ہمارا دل اگر شیدا نہ ہوتا   تو ایسا عشق کا چرچا نہ ہوتا

جب کہ نسخۂ لاہور میں ۱۱۶۸ھ لکھا ہوا ہے، دوسری غزل پر ۱۱۵۴ھ درج ہے جب کہ نسخۂ لاہور میں ۱۱۴۳ھ موجود ہے، اس غزل کا مقطع ہے

نزع کے وقت وہ حاتم نہ ہوا بالیں پر   مرتے مرتے بھی میں شرمندۂ احساں نہ ہوا

زمینِ ولی کی غزل: جس کے دل میں ترا خیال ہوا

۱۱۴۳ھ کی بتائی گئی ہے، جب کہ نسخۂ لاہور میں ۱۱۳۳ھ ہے۔

موصوف نے اس غزل کے اشعار نقل کرنے میں احتیاط سے کام نہیں لیا ہے، ترا کی جگہ تیرا لکھا ہے، دوسرے شعر کا مصرع اول یوں نقل کیا گیا ہے ؎ ہجر میں زندگی سے مرگ پہلے جب کہ لفظ پہلے نہیں بھلی ہے، اسی طرح کی اور بھی کئی غلطیاں در آئی ہیں، سودا کی زمین والی غزل ۱۱۵۵ھ کی بتائی گئی ہے، جب کہ نسخۂ لاہور میں ۱۱۶۹ھ اور نسخۂ علی گڑھ و رام پور میں ۱۱۶۷ھ درج ہے، اس غزل کا مطلع ہے۔

شانہ نہ کچھ زلفوں کو زنہار دیکھنا   بہتوں کے دل ہیں اس میں گرفتار دیکھنا

[1] انتخاب دیوان حاتم، کان پور، ۱۹۲۵ء۔

فاضل مقالہ نگار نے غزل کے کل پانچ اشعار نقل کیے ہیں جب کہ حسرت کے انتخاب میں تیرہ اشعار ہیں اور نسخہ لاہور و رام پور اور علی گڑھ میں پندرہ اشعار درج ہیں، موصوف نے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے خود کم اشعار کا انتخاب کیا ہے یا مخطوطے میں ہی پانچ اشعار لکھے گئے ہیں، تعارفی تحریر میں بھی تسامحات موجود ہیں، مسلکی عقیدت میں غلو کی حد تک تحریف کے ارتکاب سے بھی انہیں عار نہیں ہوتا، ان کی تحقیق متون میں تشکیک کی حدوں کو بھی پار کر جاتی ہے، انہوں نے لکھا ہے:

وہ (حاتم) خاندانِ رسالتؐ کے تئیں اپنے حسن عقیدت کا اظہار بار بار کرتے تھے، اس قسم کے چند شعر درج ذیل ہیں:

شاہ مرداں کی شجاعت میں یقیں سے حاتم　　قصۂ حیدری و دیکھ لے حیدر نامہ

قصہ حیدری و حیدر نامہ پر حاشیہ لکھا ہے:

"۱؎ ۲؎ قصۂ حیدری و حیدر نامہ سے مراد حملۂ حیدری و حربۂ حیدری (سال تصنیف ۱۱۵۰ھ) ہے، ان کتابوں کے متعدد قلمی نسخے راجہ محمود آباد کے کتب خانے میں محفوظ ہیں"۔[1]

یہ غزل ۱۱۵۶ھ کی ہے، دیوان زادہ نسخہ لاہور میں اس غزل میں نو اشعار موجود ہیں، جو دیوان زادہ مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار میں بھی شامل ہیں، علی گڑھ و رام پور میں بھی نو اشعار ہیں، ہاں نسخہ لندن میں صرف آٹھ اشعار ہیں، ان چاروں نسخوں میں مقطع کا متن ایک ہے اور نسخہ محمود آباد سے مختلف ہے، یہ چاروں نسخے دیوان زادہ کے ہیں یعنی قدیم دیوان کا انتخاب ہے جو ترمیم و تبدیلی کے بعد شاہ حاتم نے مرتب کیا تھا، ڈاکٹر اکبر حیدری کا خیال ہے کہ نسخہ محمود آباد تمام نسخوں میں سب سے قدیم نسخہ ہے[2]، جو ۱۱۶۹ھ کا مکتوبہ ہے جب کہ یہ بات غلط اور گمراہ کن ہے وہ بھول گئے کہ نسخہ لندن اور نسخہ کراچی بھی ۱۱۶۹ھ میں تیار کیے گئے تھے، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اس نسخے کے تعارف میں عنوان ہی قائم کیا ہے، "دیوان زادہ نسخہ ۱۱۶۹ھ" ان کی رائے میں یہ مخطوطہ حاتم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے یا کم سے کم ان کی اپنی زیر نگرانی لکھا گیا ہے[3]، اس امر کا

[1] تحقیقی نوادر، مہری نگر، مارچ ۱۹۷۴ء، ص ۷۱۔ [2] ایضاً ص ۸۲۔ [3] دیوان زادہ، مطبوعہ لاہور، ص ۱۸۔

اعتراف خود ڈاکٹر اکبر حیدری نے بھی کیا ہے[1]، انہوں نے نسخہ لندن، لاہور، رام پور اور علی گڑھ کا مقالے میں تذکرہ بھی کیا ہے، موصوف نے نسخہ لندن کے تعارف میں اعتراف بھی کیا ہے۔

"جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے دیوان زادہ حاتم کے ضخیم دیوان قدیم کا انتخاب ہے جو انہوں نے ۱۱۶۹ھ میں مرتب کیا تھا، اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے"۔

اس اعتراف کے بعد نسخہ محمود آباد کو سب سے قدیم کہنا مغالطہ آمیز ہے، خود ان کے بیان میں یہ تضاد حیرت انگیز ہے، تحقیق ہو یا تنقید انہیں اثبات و استقرار حاصل نہیں ہے، علمی مہم جوئی میں نت نئے حقائق سامنے آتے رہتے ہیں اور کلیے بدلتے رہتے ہیں، تلاش و تعبیر کا قافلہ رواں دواں رہتا ہے، مطلقیت یا ادعائیت حرف ممنوع ہے، ڈاکٹر اکبر حیدری ہر دریافت کو نادر و نایاب ہی سمجھتے ہیں۔

اس اعتبار سے محقق یا مصنف کی خطائیں معاف کی جا سکتی ہیں لیکن متون میں تحریف ایک بد دیانتی ہے اور قابل مذمت اور پھر تحریف سے استنباط نتائج سب سے زیادہ مذموم و مہلک قرار دیے گئے ہیں، موصوف اس جرم میں ملوث ہیں، دیوان زادہ کے ان چاروں اہم نسخوں میں مذکورہ بالا مقطع اس طرح ہے۔

شاہ مرداں کی شجاعت میں یقیں سے حاتم　　حملۂ حیدری اور دیکھ لے خیبر نامہ

حملۂ حیدری کو قصہ حیدری اور خیبر نامہ کو حیدر نامہ میں تبدیل کر دینا تحریف کی بدترین صورت ہے، یہ الفاظ خلیفہ چہارمؓ اور داماد رسولؐ کی شجاعت اور بہادری کے عظیم واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہیں، موصوف نے حملۂ حیدری یعنی جاں بازی و جاں سپاری کی تاریخی حقیقت کو قصہ کہانی قرار دے کر پورے واقعہ کی اہانت کی ہے، ان پر کیا فرد جرم عائد کیا جا سکتا ہے، اس طرح جیسے "میر انیس کے مراثی میں ڈرامائی عناصر" کی تلاش کو کیا کہیں گے، راقم اسے مرثیے کے تقدس سے انحراف گردانتا ہے، ڈرامہ مرادی معنوں میں ہو یا عمومی مفہوم میں نوٹنکی اور بھٹی کا بدل ہے، ہم تنقید و تحقیق کے نام پر جنوں میں نہیں بلکہ ہوش و خرد میں کیا کیا بکتے رہتے ہیں، اس کا احتساب نہیں کرتے، ڈاکٹر اکبر حیدری نے کمال یہ کیا کہ اس تحریف کو دو کتابوں سے منسوب کر دیا، شاید یہ

[1] تحقیقی نوادر، ص ۸۲۔

بتانے کے لیے کہ یہ نایاب زمانہ مخطوطات ان کی نظر سے گزرے ہیں، وہ ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں کہ شاہ حاتم نے بھی ان دونوں مخطوطات کا مطالعہ کیا تھا، غلط تحقیق سے گمراہ کن نتائج برآمد کرنے کی یہ بدترین مثال ہے، ان کتابوں کے بارے میں شاہ حاتم کے فرشتوں کو بھی شاید خبر نہ ہو مزید براں اگر متن میں یہ الفاظ ہوتے بھی تو کتابوں کی طرف اشارہ ظاہر نہیں ہوتا، یہ جنگ خیبر ہے، جو انسانی تاریخ میں فتح و کامرانی کی تمثال ہے، اس کی نفی کر کے کتابوں سے منسوب کرنا غلط رجحان کی غمازی کرتا ہے۔

اگر ڈاکٹر حیدری کو ثابت کرنا تھا کہ شاہ حاتم خاندانِ رسالت مآبؐ سے عقیدت رکھتے تھے تو اس تحریف کی قطعی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ شاہ حاتم ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھے، اہل بیت سے محبت رکھنا ان کے لیے جزوِ ایمان تھا، ان کے کلام میں جگہ جگہ ان سے والہانہ احترام کا اظہار ہوا ہے، اہل بیت پر ہی موقوف نہیں انہوں نے تو ائمہ حضرات کی شان میں نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے اور ان بزرگوں کے حوالے اتنی کثرت سے کلام حاتم میں محفوظ ہیں کہ فائز کے کلام میں نہیں ملتے، جو مذہباً شیعہ تھے، اس تحریف سے خطوط اقبال میں جعل سازی کی مثالیں یاد آتی ہیں جو قادیانی عقیدے کے احباب نے کی ہیں، ادبی تحقیق میں یہ اکثر ہوا ہے کہ عقائد، تحقیق و تنقید میں حائل ہوتے رہے ہیں، یہ انسان کی نفسیاتی اور بشری کم زوری بھی ہے، جس میں فہم و فکر معطل ہو جاتی ہیں اور عقیدہ، شدت کی صورت اختیار کر لیتا ہے، دعوت و تبلیغ کے لیے قرآن نے احسن طریقہ کار کو اپنانے کی تاکید کی ہے، بیسویں صدی میں بعض بزرگوں نے مسلکی مطالعہ کی ابتدا کی، مختلف شعرا کو اپنے مسلک کا حامی و حمایتی قرار دینے کے لیے تحقیق و تنقید کو عقیدے سے بھی وابستہ کیا گیا جس کی ایک مثال غالب کو شیعہ ثابت کرنے کی مہم تھی، اسی طرح اقبال کو بھی اثنا عشری ثابت کرنے کی کوشش میں ڈاکٹر اکبر حیدری کی کاوشیں اور کارنامے کسی جنگی مہم سے کم نہیں ہیں، ان کی تصنیف اقبال اور رفسنجانی یا اقبال کی دو نماز جنازہ (رسالہ حدیث دل، دہلی) ان کے مخصوص منصوبے کی حکمت عملی کے مظاہر ہیں، حالاں کہ اس کی ضرورت نہ تھی، کیوں کہ اقبال نے آل رسولؐ سے جس بے پناہ فکری اور جذباتی تعلق کا اظہار کیا ہے، وہ بڑے سے بڑے مبلغین دین اور مرثیہ نگاروں سے بھی نہ بن پڑا، یہ اقبال کا صرف اپنا معاملہ نہ تھا بلکہ انہوں نے عام

مسلمانوں کے جذبہ و احساس کی ترجمانی کی ہے، کسی ایک مسلک یا فرقے کی نہیں، اقبال نے بڑی دردمندی سے ایسے ہی لوگوں سے باخبر رہنے کی تاکید کی تھی۔

اے گرفتار ابو بکرؓ و علیؓ ہشیار باش

شکر ہے کہ وہ علامہ اقبال پر بھی چونکا دینے والی تحقیقات بڑے زعم کے ساتھ پیش کرتے ہیں جن میں جھوٹ سچ کا طومار ہوتا ہے، صداقتیں برائے نام برآمد ہوتی ہیں، ان کی حالیہ کتاب "اقبال نادر معلومات" ہے، اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے عالمی شہرت کے مالک ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی نے لکھا ہے:

> "غلطی کا صدور بڑے سے بڑے مصنف اور محقق سے بھی ہو سکتا ہے مگر دانستہ غلط بیانی ناقابل معافی ہوتی ہے، افسوس ہے کہ حیدری صاحب کہیں کہیں صریح غلط بیانی سے بھی دریغ نہیں کرتے .... نواب ذوالفقار علی پر پورا مضمون انہوں نے "استفادہ" کے نام سے محمد عبداللہ قریشی کے ہاں سے نقل کر لیا، دوسری مثال مہاراجہ کشن پرشاد اور اقبال پر مضمون کی ہے، اس میں بھی انہوں نے شاد کے حالات زندگی محمد عبداللہ قریشی کی کتاب "اقبال بنام شاد" کے دیباچے سے بلا حوالہ نقل کیا ہے، اسی طرح کی ایک اور مثال مضمون "اقبال شناس" طارق لاہوری میں ملتی ہے"[1]

حیرت ہے کہ جو کتابیں وجود میں ہی نہیں آئیں، ان کا بھی حوالہ دینے سے وہ باز نہیں آتے، مثلاً نکات اقبال، تبرکات اقبال، اقبال اور خدمت قرآن، مثنویات اقبال وغیرہ، تکذیب و تحریف کے ساتھ دزدی و دلاوری کی مثالیں دیکھنی ہوں تو تحقیقات حیدری سے رجوع کر سکتے ہیں۔

[1] اقبالیات، لاہور جولائی ۲۰۰۶ء ص ۱۷۵۔

اخبار علمیہ

مکتبہ اسکندریہ مصر کا شعبہ مخطوطات ۲۰۰۴ء سے مخطوطات کے مختلف موضوعات پر مسلسل بین الاقوامی سیمینار کرا رہا ہے، ۲۰۰۴ء کا موضوع "الفی مخطوطات" تھا، ۲۰۰۵ء میں اس نے "دستخط شدہ مخطوطات" کے عنوان سے سیمینار کرایا، ۲۰۰۶ء کے سیمینار کا موضوع "شروح وحواشی سے متعلق مخطوطات" اور ۲۰۰۷ء کا "ترجمہ شدہ مخطوطات" تھا، اب آیندہ برس اس نے ان مخطوطات پر سیمینار کرانے کا عزم ظاہر کیا ہے جن کے مولفین و مصنفین کے نام کسی سبب سے ابھی تک گوشہ گمنامی میں ہیں یا جن کا اب تک ۱۰ فی صد حصہ شائع ہو سکا ہے، اس کے سکریٹری یوسف زیدان کے مطابق ملک و بیرون ملک کے فضلا اور اس میدان کے ماہرین تین روز تک اس طرح کے ذخیرہ مخطوطات پر بحث و تجزیہ کریں گے اور بتائیں گے کہ ان کے اصل مصنفین کے ناموں کا پتا چلانے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں اور بھی متعدد مسائل و مباحث پر اس مذاکرے میں مقالے پڑھے جائیں گے، مثلاً علمی تالیفات کو ضائع کرنے والے عوامل، غائب شدہ مخطوطات کی مشترک خصوصیات، متون کی دوسری زبانوں میں کتابت، نایاب مخطوطات کی اہمیت اور انہیں منظر عام پر لانے کے لیے فہرست سازی وغیرہ، یہ امر بھی زیر بحث آئے گا کہ ابوعلی القالی کی کتاب الامالی اور ابوالفرج اصفہانی کی کتاب الاغانی کے بعض متون و مندرجات دوسری کتابوں میں کیوں مدغم ہو گئے ہیں۔

شمالی افریقہ کے ملک لیبیا کے ۹۷ فی صد مسلمانوں میں اکثریت سنی مسلمانوں کی ہے، البتہ ۵ سے ۱۰ فی صد عبادی فرقے (خوارج) سے تعلق رکھنے والے بھی ہیں، وہاں تمام شہریوں کو مفت تعلیم دی جاتی ہے جو سکنڈری سطح تک لازمی ہے، افریقہ کے مسلم ممالک میں لیبیا کی شرح خواندگی سب سے زیادہ ۸۸ فی صد ہے، ۱۹۵۱ء میں اس ملک نے برطانوی حکومت سے پروانہ آزادی حاصل کیا اور پہلی یونی ورسٹی شہر بنغازی میں بنائی، ۱۹۷۵-۱۹۷۶ء کے تعلیمی سالوں

میں اس یونی ورسٹی میں ۱۳۴۱۸ طلبا و طالبات تھے، ۱۹۷۵ء میں لیبیا میں صرف دو یونی ورسٹی تھی، ۱۹۸۰ء تک یہ تعداد بڑھ کر ۹ اور اب ۸۴ بتائی جاتی ہے جس میں ۱۲ پبلک یونی ورسٹیاں ہیں، اندازے کے مطابق لیبیا کی کل آبادی کا ۱/۷ حصہ طلبا و طالبات پر مشتمل ہے، ۷۰ ہزار تشنگان علم پیشہ ورانہ اور ٹیکنیکل تعلیم سے وابستہ ہیں۔

۳۱/ اپریل ۲۰۰۷ء کو ارسیسا میں Miss Kishinjan Eshenkulova نے ایک لکچر دیا، اس کا موضوع "عہد تیموری کے مدارس اور تاریخ و تہذیب اسلامی کی ترقی میں ان کا رول" تھا یہ کرغیزستان کی مشہور ماہر تاریخ ہیں لکچر میں انہوں نے کہا کہ تیمور نے اپنی سیاسی قوت کو متحد و مضبوط کرنے کے بعد دارالسلطنت سمرقند میں علما و فضلا کو جمع کیا، جہاں اس نے متعدد تہذیبی و تعلیمی ادارے قائم کیے جن میں مدارس بھی تھے، اس کے عہد میں سمرقند کے اہم مدرسوں میں بی بی خانم مدرسہ، الغ بی مدرسہ، شیخ ملک مدرسہ اور قطب الدین صدر مدرسہ کے نام نمایاں ہیں، تدریسی اداروں کے نصاب تعلیم اور معلمین کے بارے میں ہمیں زیادہ معلومات دست یاب نہیں ہو سکیں، تاہم جس قدر بھی مہیا ہو سکی ہیں ان کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ فقہ و تفسیر کی اعلا تعلیم کے ساتھ ان میں سائنسی علوم میں علم ریاضی و فلکیات کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور تیمور کے پوتے الغ بی کو براہ راست سائنسی و طبیعی علوم سے دل چسپی تھی اور اس کے مدرسے میں علم ریاضی و علوم طبیعیہ خاص طور پر شامل نصاب تھے، اس سے وابستہ درج ذیل علما و فضلا کے نام انہوں نے لیے Ali Kuscu, Kadizade Rumi غیاث الدین جمشید، معین الدین۔ لکچر کے آخر میں عہد تیموری کے ان عظیم اسکالرس کا تذکرہ ہے جنہوں نے خراسان، ہندوستان اور عثمانی سلطنت میں سائنسی ترقیات میں اہم کردار نبھایا تھا۔

جرمن انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک آرکائیوز نے آیندہ پانچ برسوں میں مسجدوں کی تعداد دوگنی کرنے کا منصوبہ بنایا ہے، ۱۲ سو ادارے جرمنی میں مسجدوں ہی میں چل رہے ہیں، یہاں کے مسلمانوں کی تیس لاکھ آبادی میں صرف ۱۵۹ مسجدیں ہی حکومت سے منظور شدہ ہیں، بقیہ مسجدوں کا کام ان کمروں سے لیا جاتا ہے جو دوسرے کاموں کے لیے بنائے گئے ہیں، ۲۰۰۴ء میں کل ۱۴۱ مسجدیں تھیں، واضح رہے کہ جرمنی وغیرہ یورپی ملکوں میں اس وقت حالات اسلام کی نشر و اشاعت

کے لیے اچھے اور ساز گار ہیں، جرمنی کے مسلمانوں نے شہر کالوگن میں یورپ کی سب سے بڑی مسجد بنانے کا منصوبہ بنایا ہے تاہم عیسائیوں کے مذہبی لیڈر اور شدت پسند سیاست داں اس کی یہ کہہ کر مخالفت کر رہے ہیں کہ جرمنی کی مسجدوں کی موجودہ تعداد یہاں کے مسلمانوں کے لیے کافی ہے۔

عالم اسلام کی ۴۰ ہزار صفحات پر مشتمل سب سے بڑی انسائی کلوپیڈیا کو ترتیب دینے کا سہرا ترکی کے سر پر بندھنے والا ہے، اس کی تیاری میں ترکی اور دوسرے ممالک کے ماہرین اور مختلف علوم وفنون میں درک رکھنے والے اسکالرس نے خون جگر صرف کیا ہے، ملک کا دانش ور طبقہ خاص طور پر اس سے دل چسپی لے رہا ہے، اس کی کل ۴۰ جلدیں ہوں گی اور ہر جلد میں ۵۵۰ سے ۷۰۰ صفحے ہوں گے، اس میں مذاہب عالم، آسمانی کتب، تاریخ، اسلامی غزوات اور دوسری جنگیں، مسلم ممالک اور غیر مسلم ممالک میں مسلم اقلیتیں، تذکرہ وسوانح، زبانیں، میڈیا، مسجدیں، اہم اور قدیم اسلامی کتابیں، ممتاز شخصیات اور اسلام سے تعلق رکھنے والے اکثر موضوعات شامل ہیں اور ان میں بڑی تحقیق سے اور جدید طرز وانداز کے مطابق معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں، البتہ رپورٹ میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ یہ کس زبان میں ہے، یہ اطلاع "اسلامک نیوز ایجنسی (اینا)" نے دی ہے۔

برازیل میں سعودی عرب اور اسلامی ممالک کے سفرا کی خاص توجہ والتفات سے "المرکز الاسلامی" کا قیام عمل میں آیا تھا، اس مرکز کے زیر انتظام برازیل کے ۴۰ شہروں میں ۷۰ اسلامی تنظیمیں اور ادارے سرگرم عمل ہیں، برازیل میں اسلام کی نشر واشاعت کی رفتار تیز ہو رہی ہے، نومسلموں کی دینی، تعلیمی اور تربیتی ضرورت کے پیش نظر برازیل میں ایک بڑے اسلامی ادارے یا مدرسے کے قیام کا منصوبہ ہے، مرکز اسلامی کے سابق ڈائریکٹر کی مدت ختم ہونے کے بعد اب اس کا انتظام رابطہ عالم اسلامی کے ذمہ ہو گیا ہے اور اسی نے اس جانب توجہ کی ہے، واضح رہے کہ سعودی عرب برازیل کے معزز افراد اور نومسلموں کو سرکاری خرچ پر ادائیگی حج کے لیے بھی مدعو کرتا ہے۔

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

معراج میں پچاس نمازیں

مدرسہ حسین بخش
جامع مسجد، دہلی
۲۵/اکتوبر ۲۰۰۷ء

حدیث معراج میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت مسلمہ پر پچاس نمازیں فرض کی، پھر رسول اکرم ﷺ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے توجہ دلانے پر اللہ تعالیٰ سے تخفیف کی درخواست کی اور اس طرح حضرت موسیٰ کے توجہ دلانے پر حضور ﷺ بار بار حضرت حق تعالیٰ کی جناب میں حاضر ہوتے رہے۔

ایک سائل پوچھتا ہے کہ یہ روایت قرآن کریم کے خلاف معلوم ہوتی ہے اور دو قوی دلیلیں جو اس روایت کو ضعیف ثابت کرتی ہیں، حسب ذیل ہیں:

۱- پہلی دلیل یہ ہے، قرآن کہتا ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (سورہ بقرہ ۲۸۶، سورہ نساء ۴۵۲، مومنون ۶۲، اعراف ۴۲)

اللہ تعالیٰ کسی بندہ پر اس کی فطری طاقت سے زیادہ احکام کا بوجھ نہیں ڈالتا۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (سورہ بقرہ ۱۸۵، نساء ۴۵)

خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور تمہیں تنگی میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

پچاس نمازیں بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ تھیں اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے انہیں ہلکا کیا، قرآن کے عام اصول سے یہ حدیث ٹکراتی ہے۔

۲- دوسری دلیل یہ ہے کہ رسول پاک ﷺ کے مرتبہ علم اور مقام بصیرت وحکمت کی اس روایت سے تنقیص ہوتی ہے اور حضرت موسیٰ کے علم کی فوقیت ثابت ہوتی ہے، حضور ﷺ نے اعلان فرمایا:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف ۱۰۸) اے رسول اعلان کریں کہ میں اور میرے متبعین اس راستہ اور اس دین وشریعت پر پوری بصیرت کے ساتھ قائم ہیں، اندھیرے میں نہیں ہیں، اسی طرح قرآن مجید نے حضور ﷺ کو معلم حکمت وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (بقرہ ۱۲۹) فرمایا تو کیا معراج میں آپ کی بصیرت اور حکمت حضرت موسیٰ کی دانش مندی اور علم کے مقابلہ میں اپنے شان کمال سے خالی ہوگئی تھی؟

حالاں کہ سرور عالم ﷺ کا علم وحکمت اور بصیرت میں تمام رسولوں سے فائق وافضل ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

اسی طرح روایت معراج میں جبریلؑ امین کو شامل کیا گیا ہے اور جبریلؑ امین بھی اس قصہ میں بے علم وبے خبر ثابت ہورہے ہیں، دراصل روایت کا یہ حصہ یہودی علما کا بنایا ہوا ہے، شہرت کی وجہ سے کسی راوی نے اسے معراج کے واقعات میں شامل کردیا۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ کا واقعہ مشہور ہے جس میں حضرت موسیٰؑ کو علم تکوین حاصل کرنے میں خضرؑ کی شاگردی کرنی پڑی تھی، اس واقعہ سے حضرت موسیٰؑ کے علمی مقام پر جو نشان نقص پڑ گیا اسے یہودیوں نے دور کرنے کی وجہ سے معراج کا مذکورہ واقعہ وضع کیا اور کسی راوی نے اسے معراج میں شامل کردیا، یہودی علما مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ دیکھو یہ ہمارا اتم پر احسان ہے کہ پچاس کی جگہ تم پانچ نمازیں ادا کرتے ہو، معراج کی روایت میں بھی ہے فَاَوْحٰٓى اِلٰى عَبْدِهٖ مَآ اَوْحٰى (سورہ نجم) میں وحی سے مراد پچاس نمازوں کی وحی ہے۔

حالانکہ مفسرین نے اس وحی سے سورہ مدثر کی وحی مراد لی ہے۔ (دیکھو سورہ نجم تفسیر عثمانی)

علمائے کرام اس پر غور کریں اور اس کی توجیہ وتشریح سے اس خاکسار کو مطلع کریں، تاکہ سائل کا جواب دیا جائے۔

حقیقت حال یہ معلوم ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے اصول (لایکلف اللہ) کے مطابق پانچ نمازیں فرض کیں اور رسول پاکؐ نے پوری بصیرت وشرح صدر کے ساتھ حکم الٰہی کو قبول کیا اور معراج سے واپس آکر امت کو اس فریضہ سے آگاہ فرمایا۔

بعض علما کہتے ہیں کہ خدا نے اپنے محبوب کے ساتھ بار بار ملاقات کرنے کے شوق

میں ایسا کیا لیکن یہ توجیہ قابل تسلیم نہیں، کمزور ہے۔

روایات پر محدثانہ تبصرہ

مشہور محقق مفسر علامہ ابن کثیر دمشقی نے معراج کی احادیث پر (۲۲) صفحات میں کلام کیا ہے کہ کمزور روایات کے بارے میں فیہ غرابۃ نکارۃ کہا ہے یعنی بعض احادیث کو کمزور قرار دیا ہے۔

فرصت ملی تو علامہ ابن کثیر کی محدثانہ جحت پر روشنی ڈالی جائے گی، فقہی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فقہائے کرام کے نزدیک معراج کے موقع کی وحی "قرآنی وحی" کے درجہ کی نہیں ہے، اسی وجہ سے پچاس نمازوں کا مسئلہ ناسخ ومنسوخ میں شامل نہیں کیا گیا۔

خاکسار

اخلاق حسین قاسمی

☆☆☆☆

آثار علمیہ و تاریخیہ

ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے نام اہل علم کے خطوط

مشہور فاضل و محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ مرحوم کے نام یہ خطوط ان کے بھتیجے جناب محمد عطاء اللہ اور ان کی بہن جناب وسیمہ سز امین الدین کے توسط سے ملے ہیں، انہیں ان کے شکریے کے ساتھ معارف میں شائع کیا جارہا ہے۔ ''ض''

(۱)

پنجشنبہ ۲۷ ربیع الاول شریف ۸۷
از حیدر آباد دکن

عزیزم ڈاکٹر صاحب سلمہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

یکم صفر کا مکتوب گرامی پنجشنبہ ۷ رصفر وصول ہوا، کتاب کی انتظاری تھی، وہ بھی بحمد للہ وصول ہوئی، الحمد للہ یہ آپ کا زریں کارنامہ ہے، مجھے اس کا تو علم تھا کہ امام ابو بکر رازی نے امام ابو بکر خصاف کی ادب القاضی کی شرح کی ہے لیکن یہ نہ جانتا تھا کہ اس کا کہیں وجود بھی ہے، آپ نے اس کو متن سمجھ کر بشارت دی لیکن ابتدائی عبارت سے میں نے پہچان لیا کہ یہ شرح جصاص رازی، جسے آپ نے مسند ابو حنیفہ لکھا ہے وہ جامع المسانید ہے جسے دائرہ نے طبع کر دیا ہے، مجھے پتہ دیا گیا تھا کہ یہ شرح قاسم بن قطلو بغا ہے، مسند ابی حنیفہ کی، وہاں کے کتب خانوں میں ایسی بہت غلطیاں ہیں، فیض اللہ آفندی کے کتب خانہ میں حدیث کی کتاب صحیح ابن حبان ہے، کاش اس کی طباعت کا انتظام ہو جاتا تو بڑی بات تھی، طبرانی کے معاجم کی دریافت اپنے معلومات کے لیے کی گئی، سنا تھا کہ معجم کبیر کا سالم نسخہ نہیں ملتا، جہاں بھی ہے وہ ناقص ہے، حتصوو تصویر لینا نہیں میں اس سے عاجز ہوں۔

کونیر ولو میں صفحہ ۳۹۰ پر جس گمنام کتاب کا تعارف کیا ہے، یہ بڑی قابل قدر کتاب ہے، حدیث کی، آیندہ سال بہ شرط زندگی اس کا عکس منگانے کی کوشش کی جائے گی انشاء اللہ، کیا کتاب الاصل کی جلد اول آپ کے پاس پہنچی، اس کا مطالعہ کیا، کیا تاثرات اس سے لیے آپ - عبد المعید - نے، استانبول کے لیے کوئی نسخہ نہ دیا نہ روانہ کیا، بہت ہی خود غرض انسان ہے، میں نے کچھ نسخے خریدے تھے دوستوں

کے پاس ہدایا روانہ کرنے کے لیے، آپ کے پاس بھی انہی میں سے ایک نسخہ دیا گیا، پھر بار بار تقاضا کرنے پر مجلس سے منظوری لے کر مجھے ۵ نسخے دیے، کتاب شرح ادب القاضی تو ہمارے کام کی ہے، واپس کرنا نہیں، مگر اس مرتبہ اس کی اجرت بہت بڑھ گئی، نہ معلوم کہ اتنا فرق کیوں ہوا، تین سو اسی روپیہ سے زاید قیمت ہوئی، جس پر حیرانی ہے، میرے پاس تو اس کے متعلق یہ بہت (؟) نہیں ہے، جمادی چند دادم جان خریدم، بحمد للہ عجب ارزاں خریدم، لیکن بہ نسبت سنوات ماضیہ کے اس قیمت میں بڑا فرق ہے، پرسوں اتوار کو مجلس ہے، اس میں کتاب کو پیش کر کے اس کی قیمت کلل منڈی بھیج دوں گا انشاء اللہ، آپ نعمت غیر مترقبہ ہیں کہ آپ کے ذریعہ نوادر علم کا انکشاف ہوتا رہتا ہے، آپ کی قدر و منزلت اہل علم ہی جانیں۔

والسلام ودمتم بالخیر والعافیۃ
ابو الوفا

(۲)

یوم شنبہ ۲ رجمادی الاول ۸۹
از حیدر آباد دکن

عزیزم ڈاکٹر صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مکتوب گرامی زمانہ کے بعد موصول ہوا، آپ نے چوں کہ امالی کے فلم کے حصول کو بڑی کتاب کے معاوضہ میں لکھا تھا تو میں نے اسی کے لحاظ سے لکھا، آج کل کتب خانہ آصفیہ سے فلم نہیں لیا جاسکتا کیوں کہ جامعہ عثمانیہ میں ہڑتال ہے اور کتب خانہ اس کے ماتحت ہے، جس وقت کاروبار جاری ہوں گے اس کا فلم لے لیا جائے گا، جامع کبیر کے متعلق اتنا آپ یاد رکھیں کہ ہم نے ضرورۃً اس نسخہ کو شائع کیا ہے کہ ابو سلیمان کی روایت کا نسخہ نہیں ملا، مصر کا نسخہ ابو سلیمان کی روایت کا ہے لیکن ابتدا سے ساقط ہے، ابتدا سے پورے نوں باب نہیں دسویں کی بھی ابتدا نہیں، درمیان سے شروع ہے، گیارہواں باب یہ ہے باب مما یحنث فی الیمین التی یقع فیھا علی الواحد والذی یقع فیھا علی الجماعۃ، اخیر سے بھی نواں باب ساقط ہے اور کچھ حصہ (باب من الاختلاف فی الغصب ما یدعی فیہ صاحب العبد البیع و یخالفہ فیہ الغاصب) یعنی اس باب کا تھوڑا سا حصہ اخیر سے ساقط ہے لیکن نسخہ بہت اچھا ہے اور یہ نسخہ غیر مرتب بھی ہے، اوراق منتشرہ کو جمع کر کے اس کی جلد بندی کر دی گئی ہے، میرے پاس اس کی تصویر آئی تھی، میں نے اس کو

مرتب کیا اور نقل کرکے مجلس میں رکھ دیا ہے، مکتبہ ولی الدین کے نسخہ کو چھوڑ کر باقی جو تین نسخے ہیں ان میں سے ایک کامل باب نقل کرکے ارسال ہو تو مصری نسخہ سے مقابلہ کرکے اس کا اندازہ کر سکوں گا، نیز زیادات کے ۴ نسخوں کے جو وہاں اہل علم مدعی ہیں، اس کا ابتدائی صفحہ ہر ایک صفحہ نقل کرکے ارسال کیا جائے تو اندازہ کر سکوں گا، زیادات کے نام سے جو وہاں نسخے ہیں وہ زیادات امام محمد کی نہیں بلکہ قاضی خان کی شرح زیادات کا اختصار ہے جسے صدر سلیمان نے کیا ہے اور عتابی نے بھی اپنے شرح زیادات کا اختصار کیا ہے، جسے زیادات للعتابی کہتے ہیں، اس کا نسخہ بھی مجلس میں ہے، ان نسخوں کے سوا امام محمد کی زیادات انہی مکتبوں میں ملی ہو تو میں ناواقف ہوں، ابتدا باب کی عبارت بھیجی جائے تو تشخیص ہو سکتی ہے، وہاں کے کتب خانہ میں بڑی بڑی غلطیاں ہیں، نام کچھ اوپر لکھا ہے اندر کتاب کچھ اور ہے، اگر صحیح تشخیص ہو سکے تو مجلس کے لیے اس کا نسخہ یعنی تصویر منگا سکیں بشرطیکہ اس کی رقم کی ادائی کی صورت معلوم ہو، ہاں ترکی میں جو امام محمد نمبر نکالا گیا، مجھ جیسے ترکی سے نابلد کے لیے اس کا وجود و عدم مساوی ہے، اس کے بارے میں میں ساعی ہوں کہ صحیح خدمت ہو سکے ورنہ میں تو چراغ سحری ہوں اور پھر خانہ تاریک واللہ المستعان، کتاب الحجہ کی تیسری جلد بھی طبع ہوگئی ہے، ابھی سلائی باقی ہے، آپ اس خط کو اپنے پاس محفوظ رکھیے، تاکہ آپ کے آیندہ سفر کے وقت معلومات فراہم ہو سکیں، اگر ممکن ہو سکے تو سیر کے چند نسخوں کا عکس ہمارے لیے اتارتے جائیں، قال قلت کے طرز کا اور یکساں سرد احکام کا تو ہم اس کی اشاعت کے لیے کوشش کریں، میرے خیال میں اصل تو قلت قال ہی کا ہونا چاہیے، مگر محیط وغیرہ میں جو سیر صغیر کی عبارتیں نقل کی جاتی ہیں وہ قلت قال کے طریقہ کی نہیں ہوتیں بلکہ سرد احکام کے طور پر ہوتی ہیں، صغیر و کبیر دونوں کی، ہاں اشغال علمیہ بحمد للہ گرتے ہوئے جاری ہیں اور بدن امراض سے پر ہے، والحمد للہ علی کل حال واعوذ باللہ من حال اہل النار، یہ کتاب الاصل کی تیسری جلد بھی میرے حوالہ ہے تاختم ایمان، ترتیب پر نسخوں کا اتفاق ہے، اس کے بعد ترتیب میں بڑا اختلاف ہے اور نسخے یہاں صرف دو ہی ہیں، تصحیح کیا خاک ہو سکے، آپ کے پاس جو آرا آستانہ میں بھی قائم کیے جا رہے ہیں شاید وہ صحیح نہ ہوں بلکہ ابوسلیمان و ابوحفص کی روایتیں خلط ہوگئی ہیں مگر ابتدا سے شاید ابوحفص کی روایت موجود نہیں ہے، درمیان کے اجزا میں خلط ہے اور درمیانی اجزا روایت ابوحفص کی ضرور وہاں موجود ہیں، یہ بات ضرور قابل غور ہے۔

والسلام

ابوالوفا

مطبوعات جدیدہ

شریعت اور طریقت: از مولانا عبدالرحمان کیلانی مرحوم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۵۲۸، قیمت ۱۹۸ روپے، پتہ: مکتبہ الفہیم، فرسٹ فلور، ریحان مارکیٹ دھوبیا املی روڈ، صدر چوک، مئوناتھ بھنجن، یوپی۔

شریعت و طریقت کی وحدت کے اقرار کے بعد بھی عملاً ان کی ثنویت کی شکایت ایک عرصے سے جاری ہے، طریقت یا تصوف کو اگر ایک جانب احسان کا ترجمان باور کرایا گیا تو دوسری طرف اس کے مظاہر کی بنیاد پر اس کو مخالف ایمان بھی بتایا گیا ہے، زیر نظر کتاب اسی دوسرے مکتب فکر کے مطالعہ کا نتیجہ ہے جس کا مختصر ماحصل خود کتاب کے الفاظ میں یہ ہے کہ "دین طریقت بذات خود ایک الگ دین ہے جس کے اپنے مخصوص عقائد و نظریات ہیں"، اس اجمال کی تفصیل، دس ابواب اور ان کے تحت بیسیوں فصلوں اور پھر ذیلی مباحث کی شکل میں اس طرح پیش کی گئی ہے کہ تصوف کا شاید ہی کوئی گوشہ رہ گیا ہو، رہبانیت، تذکرے، ملفوظات، وحدت الوجود و شہود، حلول، ولایت، باطنی علوم، صوفیہ کا باطنی سیاسی نظام، مناصب اولیا، عشق و مستی، سماع و وجد، تصور شیخ، حضرت خضر کی شخصیت، رجال الغیب، شیعیت، خرقہ، آستانے، درگاہیں، تصرف، توجہ، شفاعت، کشف، کرامات، کیمیا گری، مجاہدہ، ریاضت وغیرہ عنوانوں سے تصوف کے اہم اور غیر اہم دونوں طرح کے مراجع سے استفادہ کیا گیا ہے اور اس بے حد و نہایت مطالعہ کا ماحصل وہی پیش کیا گیا ہے جو ہم نے اوپر نقل کیا ہے، کتاب کے چند اہم مضامین قریب تیس سال پہلے رسالہ ترجمان الحدیث میں شائع ہوئے تھے، چند سال بعد یہ کتابی شکل میں یک جا کردیے گئے، مباحث میں ایسے بزرگوں پر بھی تنقید ہے جو امت کے مسلمہ صاحبان دعوت و عزیمت ہیں اور جن کے دینی و علمی کمالات پر اتفاق رائے ہے، مصنف مرحوم کو بھی اعتراف ہے کہ وہ ان کے قائل ہیں لیکن تنقید ان عملی اور نظری مقامات پر ہے جہاں ان کی نظر میں کتاب و سنت سے تصادم ہے اور بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ مقامات، عقیدت مندوں کی بے جا اور حد درجہ عقیدت کی وجہ سے مشکوک و مجروح ہوئے ہیں، گو ان کا دفاع بھی علمی اور نظری سطح پر ہوتا رہا ہے لیکن مصنف مرحوم کو یہ مطمئن نہیں کر سکا ہے، دلائل ان کے پاس بھی ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جن بزرگوں کے اقوال سے انہوں نے اپنی بحث کو مدلل

کیا ہے وہ خود بھی اسی تصوف کے قائل و مداح رہے ہیں، اصل مسئلہ تصوف کی اصل اور پھر اس کی وسعت میں بے اعتدالیوں کا ہے، دوسرے علوم و فنون کی طرح اگر اس میں چند مظاہر نا قابل فہم ہیں تو بالکلیہ اس کا رد بھی غیر متوازن کہا جاسکتا ہے، جذبہ اور خلوص کی صداقت کی قدر کے ساتھ، لہجہ کی تلخی اور جابجا تیزی بھی مناسب نہیں، شاید اس کا احساس مصنف مرحوم کو بھی تھا، اسی لیے انہوں نے لغزش کے امکان کو بشری تقاضے پر محمول کیا ہے، اسی احساس کے ساتھ اگر اس کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو اسلام کی تصویر زیادہ واضح نظر آتی ہے۔

مضامین خالدی: از ڈاکٹر ابوالنصر محمد خالدی، مرتبہ: جناب مولانا عطاء الرحمان قاسمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۵۰۸، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، این-۸۰-سی، ابوالفضل انکلیو، اوکھلا، نئی دہلی-۲۵۔

قرآنی، تاریخی اور ادبی حصوں میں منقسم اس کتاب میں دس مضامین ہیں، قرآن مجید کی رجائی آیات، نباتی الفاظ، اہل کتاب میں اور کون سی قومیں، جاحظ اور ہندوستان، خالد بن سنان، تحریر الاحکام اور قاموس الوفیات لاعیان الاسلام اور آثار عمرینؓ، قصیدہ بردہ اور اصلاح کلام جیسے موضوعات پر ہر مضمون، دقت نظر اور وسعت مطالعہ کی عمدہ مثال ہے، فاضل مولف مرحوم کی کئی کتابوں کا ذکر ان سطور میں پہلے کیا جاچکا ہے، مولف مرحوم حقیقتاً فنافی العلم تھے اور ان کا مطالعہ ہمہ جہت تھا، یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ وہ بیک وقت مختلف علوم و فنون میں درک رکھتے تھے، اس کتاب کے مضامین بھی اسی حقیقت کے عکاس ہیں، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ کی کتاب حیوانات قرآنی کو دیکھ کر ان کو نباتیات قرآنی لکھنے کی تحریک ہوئی، انہوں نے اس اعتراف کے ساتھ کہ وہ اس علم کی ابجد سے بھی واقف نہیں، چند صفحات میں قرآن مجید کے نباتی الفاظ کی مکمل فہرست، سورہ، آیت، اشتقاق اور معنی کے ساتھ اس طرح پیش کی کہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کلید تحقیق بن گئی، اہل کتاب کے زمرہ میں یہودی اور مسیحی شامل ہیں لیکن ان کے علاوہ دوسری ملتیں جیسے بودھ اور ہندو بھی اس میں شامل ہیں یا نہیں، اس سوال کا جواب انہوں نے ایک طویل مضمون میں جس تحقیق سے دیا ہے وہ دل چسپ ہے اور مطالعہ و نتائج میں احتیاط کا خوب صورت نمونہ ہے، یہی حال جاحظ اور ہندوستان کے مفصل مطالعہ کا ہے جس میں جاحظ کی ادبی حیثیت کے اجمالی تعارف

کے بعد ہندوستان کے بارے میں اس کی تحریروں کی تفصیل ہے، مسلمانوں میں وہ پہلا شخص ہے جس نے ہندوستان کے بارے میں کمیت و کیفیت دونوں اعتبار سے معلومات یکجا کر کے پیش کیے اور فاضل مصنف غالباً پہلے ایسے شخص ہیں جنہوں نے موجودہ ماخذ کی مدد سے اردو میں ان کو پیش کیا، یہ مقالہ اور آثار عمرینؓ اس مجموعہ کی روح ہیں، آثار عمرینؓ کے نام سے ان کا مقالہ رسالہ برہان میں شائع ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے اقوال و ارشادات، مواعظ، واقعات اور حالات کو انہوں نے جاحظ کی کتابوں سے یکجا کیا تھا، ان آثار سے حضرات شیخینؓ کی مبارک زندگی کے ایسے فکر انگیز پہلو سامنے آتے ہیں جو عموماً ان کے اردو سوانح نگاروں سے مخفی تھے، قریب سو صفحات کے اس مضمون کی اشاعت کے بعد اس کی عربی عبارتوں کے ترجمے کے بعض مسامحات پر ڈاکٹر اجمل ایوب اصلاحی نے توجہ دلائی تھی، لائق مرتب نے اس کو شامل کر کے ایک مستحسن مثال پیش کردی ہے، اس سے مضمون کامل تر ہو گیا ہے، باقی مضامین بھی کم نہیں، اس قابل قدر مجموعہ کی اشاعت کے لیے مرتب اور ناشر کے علاوہ مصنف مرحوم کے لائق اور سعید صاحب زادے ڈاکٹر عمر خالدی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے اپنے والد کی بیش قیمت علمی میراث کو طباعت و اشاعت سے مزین کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔

رسول اکرم ﷺ اور خواتین ایک سماجی مطالعہ: از پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۲۰، قیمت ۱۲۰ روپے، پتہ: اسلامک بک فاؤنڈیشن، ۱۷۸۱-حوض سوئی والان، نئی دہلی-۲۔

اسلام نے عزت، احترام، مساوات اور پاس داری کی جو نعمتیں عورت ذات کے لیے عطا کیں اس کی تفصیل انسانی تاریخ کا اہم باب ہے، رسول اسلامؐ کی حیات طیبہ میں اور آپؐ کے تعمیر کردہ معاشرے میں اس کے جلوے بڑے تابناک ہیں اور سیرت اور سیر الصحابہؓ میں جابجا ان کی جھلکیاں نظر آتی ہیں لیکن ایک مربوط اور مستقل اور عصر حاضر کی زبان اور مطالبات کی شکل میں اس کے مطالعے اور جائزے کی ضرورت تھی، اس کتاب کے فاضل مصنف کو سیرت نبویؐ کے متعدد اچھوتے پہلوؤں کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی ہے، اسی سعادت کا ایک مظہر زیر نظر کتاب بھی ہے جس میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے عہد نبوی میں خواتین خصوصاً خواتین اسلام کی سماجی حیثیت

کا وسیع النظری سے دلچسپ اور مثبت اور کسی قدر جرأت مندانہ جائزہ لیا گیا ہے، مرد و زن کے تعلقات میں فاضل مصنف کا خیال ہے کہ ناقص تربیت اور ناقص تر معلومات اور مردانہ توہمات کی وجہ سے ہماری سوچ بالعموم منفی رہتی ہے لیکن یہ بھی ہے کہ مثبت سوچ کے حصول میں ناقص مطالعہ تر اور ناقص تر استنتاج کے خدشات بھی حائل ہوتے ہیں، اختلاط صحابہ و صحابیات کا موضوع بھی بڑا نازک ہے، خواتین سے ملاقات، خرید و فروخت، کسب معاش، غزوات میں شرکت، اپنے حقوق کے حصول کے لیے جد و جہد اور مردانہ تحکم کے خلاف احتجاج پر بحث آسان نہیں لیکن اس کتاب میں واقعات کو جس مدلل اور محتاط زبان میں پیش کیا گیا ہے، اس سے انکار یا اختلاف کی گنجائش نہیں، خصوصاً ان کے لیے جن کو فاضل مصنف نے بے جا متقی یا متقیان عہد سے تعبیر کیا ہے اور اس محتاط نتیجہ مطالعہ سے انکار کیسے کیا جاسکتا ہے کہ ”شریعت بے محابا، بے وجہ اور بے قید اختلاط مرد و زن کی قائل نہیں لیکن وہ اجتماعی میل ملاپ، دینی ملاقات، سماجی زیارات اور دوسرے معاشرتی میل جول کی اپنی حدود میں اجازت بھی دیتی ہے“، کتاب کا اسلوب قطعی منطقیانہ ہے لیکن بعض جگہ عموم، موہوم میں بھی نظر آتا ہے، مثلاً حضرت عمرؓ و ابن ام کلثومؓ کے واقعہ میں یہ کہنا کہ صحابی موصوف بینائی نہ ہونے کے سبب گھر میں داخلے کے وقت کسی شخص سے ٹکرا سکتے تھے اور دوسرے مسائل پیش آسکتے تھے، اس کے علاوہ متعدد دوسری وجوہ بھی تھیں، یہاں دوسرے مسائل، دوسری وجوہ کی وضاحت زیادہ بہتر ہوتی، اسی طرح بچیوں کی نغمہ سرائی کی چند روایات کی بنیاد پر یہ سرخی کہ ”موسیقی اور تفریح سے وابستہ طبقہ نسواں“ بھی محل نظر ہے، حضرت خدامؓ بن ودیعہ اوسی کو ابو ودیعہ کہنا بھی درست نظر نہیں آتا، بہرحال یہ سماجی مطالعہ فاضل مصنف کی دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی کی وجہ سے چشم کشا ہی نہیں بصیرت افروز بھی ہوگیا ہے۔

مقالات عرفان: از ڈاکٹر عبدالرب عرفان مرحوم، مرتبہ: ڈاکٹر خالدہ نگار، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۵۰، قیمت ۴۰۰ روپے
پتہ: عبدالمتین، غالب روڈ، وارث پورہ، کامٹی اور تاج بک ڈپو، مومن پورہ، ناگ پور اور مکتبہ جامعہ، نئی دہلی۔

فارسی زبان و ادب کے ادا شناس کی حیثیت سے اس کتاب کے مولف مرحوم نے اپنی ایک جدا شناخت قائم کرلی تھی، دیوان شاہ سید غلام حسین ایلچ پوری کے متن کی تصحیح اور ”داراشکوہ، اپنی

نگارشات کے آئینہ میں“ کی تالیف نے ان کو سنجیدہ اور محنتی محقق کی شان عطا کی، علم عروض اور فن تاریخ گوئی میں بھی ان کو بہت مہارت حاصل تھی، رسالہ ”معارف“ میں بھی ان کے کئی بلند پایہ مقالات شائع ہوئے جن سے اہل نظر کی نظران کی جانب مبذول ہوئی، زیر نظر کتاب میں ان کے ان اور دوسرے رسائل میں شائع ہونے والے چند اور مقالات کو جمع کیا گیا ہے، کلیات خسرو، چہار مقالہ، راحت القلوب، فتح نامہ محمود شاہی، مثنوی رمز الریاحین وغیرہ کے تعلق سے ان کی یہ تحریریں، تحقیق اور تنقید کی عمدہ مثالیں ہیں، ایک مقالہ اورنگ زیب کی زندگی کے اہم واقعات کی تاریخیں، ”معارف“ میں شائع ہوا تھا، تاریخ گوئی کے باب میں یہ بڑا دلچسپ اور قابل قدر ہے، اسی طرح مضمون ابوطالب کلیم کے چند قطعات تاریخ بھی مولف مرحوم کی تاریخ گوئی کی مہارت کی علامت ہیں، فارسی شاعری میں تسکین اوسط کا رواج اور جواز کے عنوان سے ایک مقالہ ہے اور یہ ان کی عروض شناسی کا شاہد ہے، ان گراں قدر مقالات کو یکجا کر کے ان کی لائق شاگردہ نے حق شاگردی ادا کردیا۔

النزعات الجدیدۃ فی الشعر العربی الحدیث: از شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۶۰۰، قیمت درج نہیں، پتہ: شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

اردو شاعری کی طرح، عربی شاعری نے بھی روایتی مضامین اور اسالیب کی ثروت کو محفوظ رکھتے ہوئے جدید شعری رجحانات اور ہیئتوں سے دوری اور تنگ نظری کا رویہ اختیار نہیں کیا، حافظ ابراہیم، احمد شوقی، رصافی، جبران، محمود حسن اسماعیل، زہاوی، ودیع البستانی جیسے شعرا کی شعری کاوشوں میں روایت سے بغاوت کیے بغیر مغربی ادب سے تاثر واضح ہے، مثلاً شوقی کے بارے میں لکھا گیا کہ اس نے مغربی فکر و فن کی کورانہ تقلید کی بجائے کسب فیض کے سلسلوں کو دراز کیا، اکتساب فیض اور اثر پذیری کا یہ عمل دوسری اور زبانوں کی طرح مختلف ادوار کو عبور کرتے ہوئے آج بھی جاری ہے اور یہ اس کتاب کے مقالات و مباحث سے بہ خوبی عیاں ہے اور یہ مسلم یونی ورسٹی کے شعبہ عربی کے ۲۰۰۴ء میں جدید عربی شاعری کے تازہ رجحانات کے عنوان سے منعقدہ ایک سمینار کا ثمرہ ہے جس میں عربی زبان کے علاوہ اردو اور انگریزی میں بھی مقالات پیش کیے گئے تھے، پروفیسر اجتبا ندوی نے عربی اور اردو کی آزاد شاعری کا موازنہ کیا ہے، کویتی

شاعر خلیفۃ الوقیان کی شاعری پر پروفیسر اقبال حسین ندوی کا مقالہ تازگی کا احساس دلاتا ہے، ایک اور مفید مقالہ کیرالا کی عربی شاعری کے جدید رجحانات کے عنوان سے ہے، اردو مقالہ نگاروں میں سید احتشام احمد ندوی، پروفیسر عبدالباری، پروفیسر محمد یاسین مظہر صدیقی اور انگریزی حصہ میں پروفیسر ایم سلیم خاں، پروفیسر محمود الحق، پروفیسر عبدالعلی اور ڈاکٹر عبید اللہ فہد جیسے اصحاب قلم کی موجودگی نے اس مجموعہ مضامین کو وقعت عطا کردی ہے، اپنے موضوع پر یہ یقیناً عربی ادب کے شائقین کے لیے ایک مفید اور معلومات انگیز تحفہ ہے۔

عالم عرب و اسلام: از پروفیسر مولانا محمد حسان خاں، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۱۹۸، قیمت ۲۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ دین و دانش، غریب خانہ ۱۳- مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال۔

کتاب کے مصنف بھوپال یونی ورسٹی کے شعبہ عربی کے صدر ہیں اور عالم عرب سے ان کا قریبی تعلق ہے، عرب بلکہ عالم اسلام کے مسائل پر ان کی گہری نظر ہے، یہ کتاب ان کی اسی دل چسپی کی غماز ہے جس میں عرب اور اسلامی ملکوں کی جغرافیائی، اقتصادی، سیاسی، سماجی، ادبی اور دینی حالت کے متعلق ۲۸ مضامین میں جدید معلومات ہیں، ترجمہ کے علاوہ ان میں طبع زاد تحریریں بھی ہیں لیکن لائق مولف کی رواں تحریر سے یہ فرق محسوس نہیں ہوتا، موجودہ مسلمان ملکوں کی سرگرمیوں کے تعلق سے یہ کتاب یقیناً فائدہ بخش ہے۔

خطبات جاپان (اسلامی تعلیمات): از ڈاکٹر حافظ سلیم الرحمان خاں ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۱۶۰، قیمت درج نہیں، پتہ: ۲۷- ایمان منزل، مقدس نگر، پل بوگدہ، بھوپال۔

اس کتاب کے مولف ایک فعال، متحرک اور اسلامی جذبے سے سرشار نوجوان ندوی ہیں، ان کی سرگرمیوں کا میدان سرزمین جاپان ہے جہاں وہ معلم و مبلغ کی حیثیت سے قابل رشک خدمات انجام دے رہے ہیں، جاپان کی مساجد میں انہوں نے عقائد و عبادات کے متعلق جو مفید خطبے دیے ان کا ترجمہ ان ہی کے قلم سے ہے، شروع میں مولانا سید رابع ندوی، مولانا سعید الرحمان اعظمی ندوی اور دوسرے علما کی تقریظیں بھی ہیں۔

ع - ص